چلتے چلتے
شہزاد رضوی

شہزاد رضوی اپنی شاندار خاندانی، علمی و ادبی وراثت پر نازاں بیک وقت دو زبانوں یعنی انگریزی اور اُردو کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دو زبانیں کیوں؟ یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ دو تہذیبوں کے درمیان ایک ایسے پل کی حیثیت رکھتے ہیں جو اُن کے بیچ حد فاصل قائم نہیں کرتا بلکہ اُنہیں جوڑتا ہے دراصل شہزاد رضوی کے سخن میں مشرقیت اور مغربیت کا حسین امتزاج ہے، نثری نظم کو انہوں نے اپنا اسلوب سخن قرار دیا ہے اور روایتی موضوعات سے ہٹ کر اُن موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جو آج کی عصری حسیت سے عبارت ہیں۔

پروفیسر آفاق احمد
بھوپال (انڈیا)

☆☆

ڈاکٹر شہزاد رضوی کی نظموں کی بڑی خوبی اُن کے وہ موضوعات ہیں جو زندگی کے قرب سے اُٹھائے گئے ہیں۔ چراغوں کی طرح روشن یہ نظمیں اپنی طرف سے دُنیا کی تیرگی مٹانے کی بھرپور کوشش کررہی ہیں۔ زندگی کو آئینہ دِکھا رہی ہیں، صبح نو کی آرزو کررہی ہیں، ابن آدم کے بہتے ہوئے خونِ ناحق پر آنسو بہا رہی ہیں۔

گلستانِ اُردو اَدب میں دادِ سخن کے پھول برسانے کے ساتھ میری یہ آرزو ہے کہ چمن ادب میں شہزاد رضوی کے سخن کے سدا بہار پھول ہمیشہ مہکتے رہیں اور اس بہار کی کبھی خزاں نہ ہو۔

ڈاکٹر سیدہ عمرانہ نشتر خیرآبادی
اٹلانٹا، (امریکہ)

چلتے چلتے

شہزاد رضوی

"CHALTE CHALTE"
By
Shazad Rizvi

کتاب کا نام : چلتے چلتے

مصنف : ڈاکٹر شہزاد رضوی

سن اشاعت : ۲۰۱۴ء

تعداد اشاعت : ۳۰۰

ناشر : حلقۂ اربابِ ادب، بھوپال

قیمت : دو سو روپے/ دس ڈالر/ پانچ پونڈ

کمپوزنگ : فاس کمپیوٹرانکس، ۷، ۳، چوکی تلیا،

مسجد غلام محبوب روڈ، بھوپال-462001

طباعت : من موہن آفسیٹ، ایم. پی نگر، بھوپال.

ملنے کے پتے : حلقۂ اربابِ ادب،

۱- ''گل کدہ'' ۸، عیدگاہ ہلز، بھوپال ۴۶۲۰۰۱ (انڈیا)

۲- ڈاکٹر شہزاد رضوی،

11200 Lock wood, Apt. No. 1120,

Silver Spring, M D, USA

Cell: 001-301-681

ہمدم و ہمسفر رابعہ کے لیے

شہزاد رضوی

احمد علی برقؔ اعظمی

ڈاکٹر شہزاد رضوی کی ویب سائٹ دیکھ کر منظوم تاثرات

کرتے ہیں روشن جہاں میں نام خیرآباد کا
ڈاکٹر شہزاد رضوی کے یہ ادبی شاہکار

اردو اور انگلش میں حاصل ہے انہیں یکساں عبور
اُن کے انگلش ناولوں سے ہے عیاں اُن کا وقار

اُن کا انگریزی ادب میں ہے نمایاں اک مقام
پھر بھی تہذیبی روایت کے ہیں اپنی پاسدار

تبصروں سے ناولوں کے یہ لگا مجھ کو پتہ
ہیں دیارِ غیر میں وہ باعثِ صد افتخار

میں نے جو دیکھا ہے اس کو دیکھنا چاہیں اگر
اُن کی ویب سائٹ پہ دیکھیں آپ آکر ایک بار

ان کے فن کا قدرداں ہو کیوں نہ برقیؔ اعظمی
ہیں وہ نشترؔ کی وراثت کے حقیقی پاسدار

☆☆☆☆

احساسات

☆☆☆☆

منظومات

پروفیسر آفاق احمد
بھوپال (انڈیا)

پیش گفتار

میں نے ایک شعری مجموعے ''سفر ایک عمر کا'' (شاعرہ: پروین کیف) کے ''پیش گفتار'' میں بھوپال کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ شہر غزل قافیوں کا شہر ہے۔ غزل کا تصوّر قافیے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا، مطلع سے مقطع تک ایک قافیہ، گویا شروع سے آخر تک یکساں اہتمام: خوش قسمت ہیں وہ شہر جو قافیوں کے ہوتے ہیں اور اُن شہروں کو کیا نام دیا جائے جو حاشیوں کے ہوتے ہیں، حاشیوں میں رہتے ہیں، حاشیہ آرائی جن کا مقدّر ہے۔

اِس وقت جب میں شہزاد رضوی کے مجموعۂ کلام کا پیش گفتار لکھنے بیٹھا تو یہ خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں آیا کہ یو. پی. کے شہروں کی بات تو چھوڑیے بلکہ وہاں تو بعض قصبے بھی ایسے ہیں جو علم و حکمت، شعر و ادب، دانائی اور فراست کے معاملے میں خوش ادائی کے ساتھ خوش سوادی کے بھی مالک ہیں۔ ان میں سے دو قصبوں کو تو میں قریب سے جانتا ہوں۔ ایک سہوان اور دوسرا خیرآباد، سہوان یوں کہ میرے اجداد کی جنم بھومی ہے اور خیرآباد یوں کہ وہ بھی ایک ایسا مسکن علم و ادب، سرزمین رشد و ہدایت جو صرف عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی ہی دھرتی نہیں بلکہ علامہ فضل حق خیرآبادی جیسے

انقلابیوں کا بھی وطن ہے۔

شہزاد رضوی کے اجداد کا تعلق بھی اسی خیرآباد سے ہے۔ اُن کا رشتہ پانچویں پیڑھی میں وہاں کے دو اعلیٰ مقام خانوادوں سے براہ راست ہے۔ یہ سلسلہ ننہال کے رشتے سے علامہ فضل حق اور ددھیال کے تعلق سے میر تفضّل حسین خاں سے ملتا ہے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کا ایک عالمِ بے بدل ہونا تو اپنی جگہ لیکن وہ آزادیٔ وطن کے متوالے ایک ایسے انقلابی بھی تھے جن کے عزائم غیر ملکی انگریز سامراجیوں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں جزیرہ انڈمان (جسے عرف عام میں کالا پانی کے نام سے جانا جاتا ہے) میں محبوس کر دیا گیا، لیکن وہاں بھی وہ ''جنوں کی حکایات خونچکاں'' لکھتے رہے۔ اگر ۱۸۵۷ء کے ہولناک مظالم کی حق گوئی و بیباک، خونِ دل میں ڈبوئی انگلیوں سے تحریر داستانِ الم دیکھنا ہوتو اُن کی تصنیف ''الشورۃ الھندیہ'' میں دیکھیے۔ یہ وہ اوراقِ پریشاں ہیں جو حبس دوام، بہ عبور دریائے شور کی اُس دل دہلا دینے والی خونی داستان کو سناتے ہیں جو کسی تماشائی نے نہیں، بلکہ اس قلزم خونیں کے ایک شناور نے لکھی ہے۔ اِن اوراقِ پریشاں و پارینہ کا مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی نے اردو میں ترجمہ کرکے ''باغی ہندوستان'' کے نام سے ۱۹۴۷ء میں ''مجمع اسلامی'' مبارکپور سے شائع کرایا۔ ان ہی علامہ فضل حق کی بیٹی سید النساء حرماںؔ کے بطن سے دو صاحبزادگان سید محمد حسین بسملؔ خیرآبادی اور سید افتخار حسین مضطرؔ خیرآبادی پیدا ہوئے۔ شہزاد رضوی کے والد سید یادگار حسین نشترؔ، مضطرؔ خیرآبادی کے بیٹے تھے۔

میر تفضّل حسین خاں خیرآباد کے ایک یگانۂ روزگار علمی و ادبی گھرانے کی ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جن کی علمیت و ذکاوت کا ایک زمانہ معترف تھا۔ نوابین ٹونک کے دربار میں اعلیٰ مقام حاصل تھا، یہاں تک کہا جاتا ہے کہ دربارِ ٹونک سے مرزا غالبؔ انہیں کے ذریعہ متعارف ہوئے۔ غالبؔ سے اُن کے دوستانہ مراسم تھے، جب غالبؔ کو اُن کے انتقال کی خبر ملی تو اُنہوں نے اپنے عزیز شاگرد ہرگوپال تفتہؔ کے نام ۲۳؍فروری ۱۸۵۴ء کے خط میں لکھا:

"ہائے ہائے میر تفضّل حسین خاں! ہائے ہائے:

رفتی و مرا خبر نہ کردی = بر بے کسی ام نظر نہ کردی

یہاں یہ سُنا گیا ہے کہ میر احمد حسین، بڑا بیٹا اُن کا، اُن کے کام پر مقرر ہوا ہے۔"

جن میر احمد حسین کا ذکر غالبؔ نے اپنے خط میں کیا ہے، اُن کی شادی علامہ فضل حق کی صاحبزادی سیدالنساء حرماں سے ہوئی تھی۔ میر احمد حسین عربی و فارسی میں بڑی استعداد کے مالک، حافظ قرآن اور شاعر بھی تھے۔ رسواؔ اُن کا تخلص تھا۔

ایسے باکمالوں کے خانوادے سے جس کا تعلق اور رشتہ ہو وہ کیونکر اپنی خوبیٔ قسمت پر ناز نہ کرے، جس کا سلسلۂ نسب علامہ فضل حق خیرآبادی اور میر تفضّل حسین خاں سے ہوتا ہوا میر احمد حسین رسواؔ اور بی بی سید النساء حرماںؔ تک پہنچتا ہو، جس کے دادا سید افتخار حسین مضطرؔ خیرآبادی ہوں، جس کے بڑے دادا سید محمد حسین بسملؔ خیرآبادی ہوں، جس کے والد سید یادگار حسین نشترؔ ہوں،

جس کے تایا ابّا سید اعتبار حسین برترؔ ہوں اور جس کے چچا جاں نثار حسین اخترؔ ہوں، جس کی چچی سیدہ خیرآبادی ہوں، گویا سارے جہاں کے آفتاب و مہتاب ایک خاندان میں ضوفشاں تھے۔ گویا شہزاد رضوی کو ادب و شعر کا ذوق وراثت میں ملا تھا اور یہ وراثت بھی کوئی ایسی ویسی نہیں تھی بلکہ خود کو اس کا امین بنانا بڑا حوصلہ طلب تھا، لیکن نہ صرف شہزاد رضوی بلکہ اُن کی بہنوں ڈاکٹر سیدہ عمرانہ نشترؔ خیرآبادی، ڈاکٹر ناہید نشترؔ خیرآبادی، سہیلہ نشترؔ خیرآبادی اور بھائی سید رضوان ضیاء خیرآبادی اور اُن کے چچازاد بھائی سلمان اخترؔ (مجموعہ کلام 'کو بہ کو'') اور جاوید اخترؔ (شاعر و نغمہ نگار) آج بھی آسمانِ شعر و ادب پر روشن ستاروں کی طرح درخشاں ہیں۔

شہزاد رضوی کی پیدائش ۲۵ر فروری ۱۹۳۷ء کو لشکر گوالیار میں ہوئی جہاں اُن کے دادا خان بہادر مضطر خیرآبادی جج تھے۔ اُن دنوں شہزاد رضوی کے والد نشترؔ خیرآبادی ریاست گوالیار کے شہر شاجاپور میں ایک امداد باہمی بینک میں ایک بڑے عہدے پر سرفراز تھے۔ شہزاد رضوی کی والدہ سیدہ سرفراز فاطمہ نشترؔ کا تعلق ریاست بھوپال کے ایک جاگیر دار گھرانے سے تھا۔

شہزاد رضوی ابتدائی اور ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھوپال چلے آئے اور وہاں کے نامور گورنمنٹ حمیدیہ کالج میں انٹر کلاسز میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک وہ حمیدیہ کالج میں زیرِ تعلیم رہے اور بالآخر انگریزی ادبیات میں ایم۔اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں تحصیل علم کا شوق انہیں کشاں کشاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لے گیا جہاں سے اُنھوں نے دوبارہ انگلش لٹریچر میں پوسٹ گریجویشن کیا۔

شہزاد رضوی نے اپنی منصبی زندگی کا آغاز حکومت مدھیہ پردیش کے محکمہ تعلیمات میں درس و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہوکر کیا۔ لیکن اُن کے سر پر تو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا سودا سوار تھا۔ چند برس بعد ہی اُنہوں نے سمندر پار جانے کا فیصلہ کیا اور اُن کا آخری پڑاؤ امریکہ ٹھہرا۔ اس دوران اُنہوں نے موسم گرما کا بہترین مصرف یہ نکالا کہ سوربون (فرانس) اور آکسفورڈ (برطانیہ) سے مختلف کورس مکمل کیے۔ پورے یورپ کا سفر کر کے وہاں کے تعلیمی اور عمرانی اداروں کا جائزہ لیا، امریکہ آکر اُنہوں نے اپنی تعلیمی استعداد میں اور اضافہ کیا۔ پی.ایچ.ڈی. کی ڈگری لے کر ڈاکٹر بنے اور پھر یونیورسٹی میں تدریسی زندگی اختیار کر کے پروفیسر (ڈاکٹر) شہزاد رضوی ہو گئے۔ صدر ریگن کے دورِ حکومت میں ایوانِ صدر میں مترجم کی خدمات انجام دیں اور مسٹر ریگن کے ساتھ بحیثیت مترجم اُن کے ہوائی جہاز میں ہم سفری کا موقع بھی ملا۔ اس دوران کئی مشہور شخصیتوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی قائم ہوا۔ اُن میں ہنری کیسنجر اور کئی دیگر اعلیٰ افسران اور اداکار بھی شامل ہیں۔

شہزاد رضوی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ اردو شعر و شاعری سے عبارت تھا۔ یہ امر فطری تھا کہ وہ بھی شعر و سخن کی طرف مائل ہوتے۔ اُنہوں نے اردو شاعری کے ساتھ اپنی ادبی قلمرو میں انگریزی کو بھی شامل کر لیا۔ اور اُن کی تخلیقات حمیدیہ کالج میگزین میں شائع ہونے لگیں۔ اُس زمانے میں حمیدیہ کالج کا علم و ادب کے معاملے میں بڑا دبدبہ تھا۔ خاص طور سے شعبۂ اردو جہاں اُن کے چچا جاں نثار اختر صدر شعبہ تھے اور اُن کے بمبئی جانے کے بعد جاں نثار اختر کی اہلیہ صفیہ اختر اس عہدے پر فائز ہوئیں۔ صفیہ اختر مشہور

شاعر مجاز کی بہن تھیں۔ ممتاز محقق ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اور ڈاکٹر ابو محمد سحر نے بھی اس شعبے کا وقار بڑھایا۔

شہزاد رضوی، حمیدیہ کالج میں، مجھ سے دو سال جونیئر تھے۔ کیونکہ میرے اور ان کے مشاغل قریب قریب یکساں تھے، ہم ایک دوسرے کے ہم مذاق تھے، اس لیے بہت جلد ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ قائم ہوگیا۔ میں ۱۹۵۸ء ایم.اے. کرنے کے بعد شعبہ اردو حمیدیہ کالج میں لیکچرر ہوگیا۔ شہزاد رضوی انگریزی ادبیات میں ایم.اے. میں زیر تعلیم تھے لیکن ہماری دوستی کا رشتہ برابر قائم رہا۔ اس زمانے میں شہزاد رضوی کالج کی زائد از نصاب سرگرمیوں میں نمایاں طور سے حصہ لیتے۔ خاص طور سے انگریزی ڈبیٹ میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے۔

شہزاد رضوی کی انگریزی زبان سے غیر معمولی دلچسپی کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ اُس وقت مشکل سے اُن کی عمر دس سال رہی ہوگی کہ ایک روز ایک صاحب، حسن احمد جعفری جن کا نام تھا، اُن کے والد نشتر خیرآبادی کے پاس آئے اور کہا کہ میں بمبئی سے آیا ہوں اور نوکری ڈھونڈ رہا ہوں۔ نشتر صاحب نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ کی تربیت کس شعبہ میں ہوئی ہے؟ اُنھوں نے بتایا کہ انھیں انگریزی زبان پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ نشتر صاحب بولے: ''فی الحال آپ میرے بیٹے کو انگریزی پڑھایئے، اس دوران میں آپ کے لیے کسی جاب کا بندوبست کرتا ہوں۔'' اس طرح شہزاد رضوی، جعفری صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ قابل اُستاد نے انگریزی ادبیات کے اسرار و رموز سے کچھ اس طرح واقف کرایا کہ شہزاد رضوی کو کم

عمری میں ہی انگریزی شاعری اور فکشن کے چسکے پر لگا دیا۔ بعد میں یہ شوق اس درجہ بڑھا کہ خود بھی انگریزی نظمیں اور کہانیاں وغیرہ لکھنے لگے اور آگے چل کر انگریزی کے ایک ممتاز فکشن نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان قائم کی۔

شہزاد رضوی کی زندگی میں ایک ایسا موڑ بھی آیا جو اُن کی پیشہ ورانہ زندگی کا رُخ بدل سکتا تھا۔ وہ جب ایف.اے. میں زیرِ تعلیم تھے تو اُن کے چچا جاں نثار اختر انہیں چند دنوں کے لیے اپنے ساتھ بمبئی لے گئے۔ وہاں شہزاد رضوی کو بمبئی میں شاعروں کی زندگی اور فلم نگری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اِسٹوڈیو میں فلمیں بنتی دیکھیں۔ جوان رعنا تھے، اُن پر نظر پڑنا یقینی تھا۔ عمر ایسی تھی کہ پردۂ سیمیں کی چمک دمک کسی کو بھی راغب کرنے کے لیے کافی تھی۔ اور جب مواقع بھی سامنے ہوں، مگر شہزاد رضوی کو تو درس و تدریس اور ادب و شعر کی دنیا بسانی تھی، انہوں نے بھوپال واپس آکر اپنی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

آج شہزاد رضوی کا شمار انگریزی کے ممتاز فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کے انگریزی ناول، "The Last Resident" کے ساتھ "Story of Finnish Woman" اور "Behind the Veil" کے علاوہ ایک انگریزی کہانیوں کا مجموعہ اور ادب اطفال میں بچوں کے لیے کہانیاں شامل ہیں۔ اوّل الذکر دو ناولوں کا تعلق نوابی دور کی ریاست بھوپال (وسط ہند) سے ہے۔ حالانکہ ناول نگار نے یہ بات واضح کرنا ضروری سمجھا ہے کہ دونوں ناولوں کا تعلق بھوپال کی شاہی فیملی یا بھوپال کے کسی شہری سے نہیں ہے بلکہ یہ مکمل طور پر Fictional ہیں، بہرحال ان ناولوں کے کرداروں کا تعلق

بھوپال کے کسی نہ کسی شخص یا خاندان سے بھلے ہی نہ ہو لیکن ان کے روپ میں ہم ایک مخصوص زمانے کے بھوپال، اُس کی تہذیب، اُس کا رہن سہن، وہاں بسنے والوں کی سوچ اور اُن کے مشاغل، اُن کی خوشیاں، اُن کے غم، اُن کے مسائل اور اُس دور کے حالات سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ The Last Resident دراصل ہندوستان میں برطانوی دور اقتدار کے آخری ایام کے پس منظر میں لکھا ہوا ناول ہے۔ محبت و نفرت کا ایک مثلث ہے جس کے اردگرد کہانی کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔ دلچسپ اور تحیّر خیز واقعات وجود میں آتے ہیں۔ ناول میں جو دوسرے شہر ہیں اُن میں بھوپال کے علاوہ دہلی، علی گڑھ اور شملہ شامل ہیں لیکن اُن کی حیثیت ضمنی ہے۔ اس ناول کے کردار اپنے وجود کا جگہ جگہ احساس دلاتے ہیں۔ ناول نگار نے نقطہ عروج تک ناول کے پلاٹ کے مطابق تصادم اور کشمکش کے عمل کو برقرار رکھا ہے۔

Behind The Veil کا موضوع ایک نوجوان مسلم دوشیزہ کا خاندان کی مخالفت کے باوجود ایک کہانی کار سے شادی کرنا اور محبت میں دھوکہ کھانا ہے۔ یہ ناول بھی بھوپال کے ہی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ کیونکہ شہزاد رضوی اپنے دور کے خاموش تماشائی نہیں تھے، اس لیے جگہ جگہ اپنی موجودگی کا اس طرح احساس دلاتے ہیں کہ یہ ناول حقیقت نگاری کی بہترین مثال بن گیا ہے۔

جب شہزاد رضوی ایک انگریزی ناول نگار اور شاعر کی حیثیت سے ایک خاص شناخت قائم کر چکے تو اُن کی بہنوں، ڈاکٹر عمرانہ نشتر خیرآبادی، ڈاکٹر ناہید نشتر خیرآبادی، سہیلہ نشتر خیرآبادی (جو کہ خود بھی شاعرہ ہیں) اور بھائی سید

رضوان ضیا خیرآبادی نے شہزاد رضوی سے اصرار کیا کہ انگریزی ادب میں ناموری برحق لیکن انہیں اپنی مادری زبان اُردو میں بھی فکر سخن کے سلسلے کو جاری رکھنا چاہیے۔ دراصل ''چلتے چلتے'' کی اشاعت اسی اصرار کی رہین منت ہے۔ اگر یہ اصرار شامل نہ ہوتا تو ہم ایک خوش فکر شاعر کے اُردو کلام کی دید سے محروم رہتے۔

ڈاکٹر شہزاد رضوی نے اپنے شاعرانہ اظہار کے لیے نثری نظم کو منتخب کیا ہے۔ ہر شاعر کو یہ حق ہے کہ وہ جس پیرایہ بیان اور اسلوب سخن کے ذریعہ اپنے موضوع کو بہتر طور پر پیش کرسکتا ہے، اُسے اپنائے۔نثری نظم شہزاد رضوی کے مزاجِ سخن کو راس آتی تھی اس لیے انہوں نے نہ صرف اُسے اپنایا بلکہ بڑے رواں انداز اور شاعرانہ بصیرت کے ساتھ عصری موضوعات کا احاطہ کیا۔

نثری نظم اردو کے لیے نئی نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے تیسرے ربع میں احمد ہمیش (''اور یہ بھی ایک ڈائری'': ۱۹۶۱ء)، سجاد ظہیر (''پگھلا نیلم'': ۱۹۶۴ء)، کشور ناہید، امین نا گی، احسن علی خاں، قمر جمیل اور دیگر شعراء نے اس پیرایۂ بیان کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

شہزاد رضوی کو جو ماحول ملا وہ نثری نظم کے اظہار کے لیے بے حد سازگار تھا۔ وہ جس جمالیاتی نظام کو اپنی فکر کے ساتھ ہم آہنگ کر کے شعر وسخن کے وسیلے سے پیش کرنا چاہتے تھے، اُسے نثری نظم کا اسلوب خوش آتا تھا۔ اُن کی شعری بوطیقا میں روایتی موضوعات کا دخل نہیں، نہ روایتی ساقی ہے، نہ مئے گل رنگ، نہ محبوبِ ستم پیشہ، نہ عاشقِ وفا شعار، نہ واعظ اور نہ محتسب! اور اگر خال خال اِن کا کہیں گزر بھی ہوا ہے تو بہ اندازِ دگر اور وہ بھی موضوع کی

ضرورت اور مناسبت سے! اس ذیل میں اُن کی نظم ''میں اور میخانہ'' کو پیش کرنا مناسب رہے گا۔ اس نظم میں اُردو شاعری کے سارے موضوعات موجود ہیں۔ لیکن شاعر کا ایمان صحیح و سلامت ہے اور طرفہ حالت یہ کہ اُس کے ایمان کی محافظت ساقی کر رہا ہے:

''میں بھی شاعر ہوں لیکن وہ وضع مجھ میں نہیں
نہ تو پیتا ہوں، نہ پلاتا ہوں اور نہ ہی واعظ کو اپنا نشانہ بناتا ہوں
پچھلے دن ریستوران میں ہجوم تھا تو مجھے میخانہ میں بٹھایا گیا
مجھے پریشان دیکھ کر ساقی بولیں:
میں کھانا بھی پیش کرسکتی ہوں اور شراب بھی
پیٹ بھرنا، مدہوش کرنا یا ہوش میں رکھنا سب میرے پیشے ہیں
کاش کہ واعظ دیکھ لیتا مجھے اس صورت میں
کہ میں میخانہ میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہوں
اور میرے ایمان کی محافظت ساقی کر رہا ہے۔''

''میں اور میخانہ'' کو شہزاد رضوی کی شاعری کا منشور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ شہزاد رضوی نے اپنے مجموعہ کلام میں طول طویل نظموں سے گریز کیا ہے۔ بیشتر نظمیں ایک صفحے میں ختم ہوجاتی ہیں۔ بہت ہوا تو دو صفحے، یا پھر ''میری توبہ'' کہ تین صفحات اُس پر صرف ہوئے ہیں۔ الفاظ کی فضول خرچی، شہزاد رضوی کو قبول نہیں۔ یہاں یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے لفظوں کی کفایت کے باوجود اپنے موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف کیا ہے۔ اُن کی مختصر نظموں میں ''میرا ایمان''، ''دولت''، ''زندگی کے اوراق''، ''کوئی ساز تو

چھیڑے''، ''رات''، ''ہم خیال''، ''سنبھل کے چلو''، ''کارواں''، ''کیا ہوا؟''، ''انسان اور میں'' اجمال میں تفصیل کی بہترین مثال ہیں۔

''چلتے چلتے'' میں صرف ایک چھ صفحات کی طویل نظم ملتی ہے۔ ''میں اور سمندر''۔ اس میں معصوم محبت کی تقدیس کو جس طرح سمندر کو گواہ بنایا ہے اور ''مچھلی اور بلیے'' کی علامت کا اطلاق اپنی محبوب ہستی کی موت پر اظہار غم کی شکل میں کیا ہے وہ دامن دل کو چھوتا ہے۔ شاعر کو پہلی بار یہ محسوس ہوتا ہے:

''اپنی خواہش کی خاطر کسی کی جان لے لینا
کتنا بڑا ظلم ہوتا ہے''

''سچ اور جھوٹ'' اور ''حق و باطل'' کے عنوانات سے آگے پیچھے دو نظمیں ''چلتے چلتے'' کا گل سرسبد ہیں۔

مجھے ان نظموں کو پڑھنے کے دوران بے اختیار JOHNSON کی ALLEGORY (تمثیل) "Truth, Falsehood and Fiction" کی یاد آئی۔ اس الیگری کا ترجمہ خوش اسلوب محمد حسین آزاد نے ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کے عنوان سے کیا ہے جو ''نیرنگ خیال'' کے حصہ اوّل میں شامل ہے۔ شہزاد رضوی کہتے ہیں:

''ابن الوقت جب مصروف رہتے ہیں زادِ آدم کی گمراہی میں
حق گو روشنی کا مینار بن کر اندھیروں پر چھا جاتے ہیں۔''

(سچ اور جھوٹ)

''باطل کے رستے پھول بھرے ہوتے ہیں

مگر منزل خوف ناک ہوتی ہے
حق کے راستے پتھریلے ہوتے ہیں
مگر منزل تابناک ہوتی ہے۔''

(حق و باطل)

شہزاد رضوی کی نظموں میں تسخیرِ قمر کے موقع پر کہی گئی نظم ''چاند'' میں ماضی سے محبت کی تڑپ ہے، جبکہ ''وقت'' میں بڑے فلسفیانہ انداز میں ''امروز و فردا'' سے ناپنے کی کہانی نظم کی ہے۔ اس کا اختتام بڑا ڈرامائی ہے۔ ''استاد شاگرد'' میں اُن پارس جیسے استادوں کو یاد کیا گیا ہے جو لوہے جیسے شاگرد کو سونا بنادیتے تھے۔ ''لیڈر اور عوام'' اور ''جمہوریت'' سیاسی نوعیت کی نظمیں ہیں جن میں آج کی سیاست کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔

اگرچہ شہزاد رضوی کی شہرت ایک انگریزی فکشن نگار اور شاعر کی حیثیت سے ہے لیکن اُنہیں اردو سے جو والہانہ لگاؤ ہے اُس کا اظہار انہوں نے ''محبت ہماری زبان ہے'' میں ''ہر رنگ اور ہر جذبے کی شدت کے بیان پر قادر اور مختلف رشتوں میں باندھنے کی ہر ادا سے واقف اردو'' کا تقابلی مطالعہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''مادی اختراعات میں چاہے ہم بہت پیچھے ہوں
جذبوں کی دوڑ تو ہم کب کی جیت چکے ہیں۔''

شہزاد رضوی سے میری رفاقت اور دوستی کی نصف صدی کی یادوں کو تازہ کرتا ہوں تو اُن کی چاہت سے خود کو سرشار پاتا ہوں اور جب اُن کے مجموعہ ''چلتے چلتے'' پر کچھ لکھنے بیٹھا تو اُس محبت و انسیت کا ایک ایک لمحہ مجھ سے

کہہ رہا تھا کہ کچھ ہمارے بارے میں بھی لکھو۔ وعدہ رہا کہ ضرور لکھوں گا لیکن اِس وقت تو مجھے شہزاد رضوی نہیں بلکہ ''پروفیسر ڈاکٹر شہزاد رضوی'' کے کلام پر گفتگو کرنا اور اپنے اس ناز کا اظہار کرنا ہے جو اُن کے کلام کی سنگت میں گزارے لمحوں کا عطیہ ہے۔ وہ دیارِ غیر میں رہ کر بھی اپنی شاندار وراثت پر نازاں، اُسے اپنے اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی خوش سلیقگی سے واقف ہیں اور اُس پر اضافی خوبی یہ کہ وہ بیک وقت دو زبانوں یعنی انگریزی اور اُردو کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دو زبانیں کیوں؟ بلکہ دو تہذیبوں کے درمیان ایک ایسے پُل کی طرح ہیں جو دونوں کے درمیان حد فاصل قائم نہیں کرتا بلکہ اُن کو جوڑنے کا فرض ادا کرتا ہے۔ لیکن مغربی تہذیب نے اُن کی آنکھوں کو اپنی چکاچوند سے خیرہ نہیں کیا بلکہ مشرق کی عظمت و محبت سے آج بھی اُن کا دل سرشار ہے۔ وہ مادیت کے ماحول میں بھی روحانی قدروں کو اپنی زندگی کا حصہ بنائے ہوئے ہیں۔

اپنی گفتگو کا اختتام اس مجموعے کی آخری نظم ''میری توبہ'' میں اُن کے ساتھ خود کو بھی شریک سمجھنے کی جسارت سے کر رہا ہوں۔

''ٹٹولتا ہوں جب اپنے اثاثے کو
خالی پاتا ہوں اپنے عمل کا خزانہ
نہ بندگی ہے، نہ حسن طاعت
اپنی کوتاہیوں کا احساس مجھے پانی پانی کر دیتا ہے۔
ندامت سے میری جبیں کے ساتھ میرا دل بھی سجدۂ شکر بجا لاتا ہے
میرے رب! میری توبہ قبول کر

میری آنکھیں برسنے لگتی ہیں
مجھے یاد آتا ہے میری امّی مجھ سے کہا کرتی تھیں
پانی برستے میں جو دعا کی جاتی ہے
وہ دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔‘‘

پس نوشت:

اُن عالی مقام نظموں پر گفتگو سے دانستہ طور پر گریز کیا گیا ہے جن پر ڈاکٹر عمرانہ، محترمہ رخسانہ، محترمہ ناہید اور سید ضیاء خیر آبادی نے تفصیل سے لکھا ہے۔ میں خود بھی اُن کے بارے میں کچھ لکھتا تو وہ اُن کے تبصرے سے مختلف نہ ہوتا۔ مجھے بھی اُن کا ہم خیال و ہم آواز سمجھا جائے۔

یکم مارچ ۲۰۱۴ء

☆☆☆☆
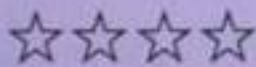
ڈاکٹر سیدہ عمرانہ نشتر خیرآبادی

اٹلانٹا، امریکہ

چلتے چلتے - ایک تجزیہ

ڈاکٹر شہزاد رضوی بڑی دل آویز شخصیت کے مالک ہیں۔ انگریزی ادب کے ادیب و شاعر نے اپنے تخلیقی سفر میں چلتے چلتے اپنے مضبوط قدم جب وادیٔ اُردو کی جانب گامزن کیے تو چمنستانِ اُردو اَدب میں کئی چہکتی ہوئی نظمیں چہچہانے لگیں۔ یہ رنگ برنگے خوبصورت پرندے گلستانِ اردو ادب میں حسن اور رونق بخش رہے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد رضوی کی نظموں کی بڑی خوبی اُن کے وہ موضوعات ہیں جو زندگی کے قرب سے اُٹھائے گئے ہیں۔ چراغوں کی طرح روشن یہ نظمیں اپنی طرف سے دُنیا کی تیرگی مٹانے کی بھرپور کوشش کررہی ہیں۔ زندگی کو آئینہ دِکھا رہی ہیں، صبح نو کی آرزو کر رہی ہیں، ابن آدم کے بہتے ہوئے خونِ ناحق پر آنسو بہا رہی ہیں۔ اُن کی نظمیں ''چلتے چلتے''، ''چیونٹیاں''، ''دولت''، ''کارواں'' اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں جو دُنیا کو اپنی طرف متوجہ کررہی ہیں اور حوصلے جگا رہی ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی نظم ''چیونٹیاں'' میں وہ لوگوں کو عزمِ سفر پر یوں آمادہ کرتے ہیں:

''کاش کوئی دنیا کے لوگوں سے یہ کہہ دے

چیونٹیوں سے ہی سیکھ لیں جینے کا ہنر
اور طے کریں اپنی زندگی کا عزم سفر"

اُن کی نظم "دولت" میں وہ دولت کے منکر نہیں لیکن اُس کی حکومت اور ظلمتوں کے قائل بھی نہیں ہیں:

"کب ختم ہوگی اُس کی حکومت ہم پر
کب دور ہوگی اُس کی ظلمت ہم سے
اور کب ہوجائے گی ہماری قدروں کی درخشاں صبح"

اُن کی نظم "چلتے چلتے" میں اُنھوں نے آج کے مجبور اور پریشان حال انسانوں کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"بھوک اور افلاس کے ناگ لوگوں کو ڈستے ہوئے
جد و جہد ناکامی کے ساحل پر سر پٹکتی ہوئی
مایوس اُمنگوں اور آرزوؤں کا گلا گھونٹی ہوئی
شیطانی طاقتیں، ابن آدم کو ذبح کرتی ہوئیں
بستیاں کھنڈروں میں بدلتی ہوئیں"

اور اسی کے ساتھ یہ پیغام بھی دیا ہے:

"اگر تم ان اندھیروں سے لڑنا چاہتے ہو
تو اپنے اندر آفتاب روشن کرو
ایک سورج دنیا کے اندھیروں کو مٹانے کے لیے بہت کافی ہے"

ڈاکٹر شہزاد رضوی کی نظمیں عظمتِ حسن کا بیان ہیں، عشق کا وقار ہیں، زندگی کا آئینہ ہیں، دَرد کی تصویر ہیں۔ جب وہ حسن و عشق کی بات کرتے ہیں

تو محبت کا معصوم جذبہ اُن کی نظموں میں دھڑکنے لگتا ہے۔ اُن کا یہ جذبہ، سوز و گداز اور دَرد وغم کے سمندر میں غوطہ زن محسوس ہوتا ہے۔ پھر شاعر عزم اور حوصلہ کی لائف بیلٹ باندھ کر درد وغم کے سمندر کو پار کرلیتا ہے۔ درد وغم میں غوطہ زن ہوتی ہوئی اُن کی نظمیں اپنے ہاتھوں میں چمکیلے موتی لیے روشنی کی طرف گامزن ہوجاتی ہیں۔ اُن کی نظمیں ''زندگی کے اُوراق''، ''کوئی ساز تو چھیڑے''، ''پیار کا موسم''، ''ہمدم''، ''کیا ہوا''، ''تم''، ''محبت کے رنگ''، ''سازو راگ''، ''غائبانہ محبت''، ''روٹھنا منانا''، ''میں تم اور سمندر'' اسی رنگ کی نظمیں ہیں۔ اُن کی نظم ''زندگی کے اوراق'' کی چند سطریں ملاحظہ فرمایئے:

''تم نے آکر ایک نئی زندگی دی ہے مجھ کو
میرے لمحات کو بھر دیا ہے خوشیوں سے
اپنی تاریخ اب کیوں نہ از سرِ نو لکھ لیں''

کچھ نظموں میں ڈاکٹر شہزاد رضوی کا لہجہ مخلصانہ و عالمانہ ہے جو اُن کے علم وفضل کی دین ہے۔ وہ اپنی نظم 'کارواں'' میں کہتے ہیں:

''آؤ آنکھیں کھولیں اور دوڑ کر کارواں کو پکڑیں
ورنہ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خوابیدہ رہ جائیں گے''

انگریزی زبان پر بھرپور قدرت ہونے اور کئی دیگر زبانوں پر دسترس ہونے کے باوجود ڈاکٹر شہزاد رضوی کو اپنی مادری زبان اُردو سے بے حد لگاؤ ہے، پیار ہے۔ اس کا اظہار اُن کی نظم ''محبت ہماری زبان ہے'' میں ہوا ہے۔ ڈاکٹر شہزاد رضوی کو اپنی تہذیب، تمدن اور میراث پر فخر و ناز ہے جو جابجا اُن کی نظموں سے جھلکتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے تہذیبی سرمائے کی حفاظت کی تلقین

بھی کئی نظموں میں کی ہے۔ نظم ''کلیدِ زندگی'' میں یہ بات خوبی کے ساتھ کہی گئی ہے۔ آج کے سائنسی اور ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ دور کے حساب سے ڈاکٹر شہزاد رضوی وقت کی رفتار کے ساتھ چلتے ہیں۔ وہ دورِ رفتہ میں جینے والے ذہنوں میں بیداریٔ شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن جب وہ اِس میں کامیاب نہیں ہوتے تو کنارہ کشی اختیار کرنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ ''یاد دورِ رفتہ'' ایسی ہی نظم ہے۔ ڈاکٹر شہزاد رضوی اُن بحث و مباحث کے بالکل خلاف ہیں جن سے درست اور اچھے نتائج نہ نکلیں اور بحث برائے بحث رہ جائے۔ نظم ''قوتِ ارادی اور مقدر'' اُن کی اسی سوچ کی نشاندہی کرتی ہے۔ نظم ''کارواں'' میں وہ سوئے ہوئے لوگوں کو جگانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''آؤ آنکھیں کھولیں اور دوڑ کر کارواں پکڑیں
ورنہ ہم ہمیشہ کے لیے خوابیدہ رہ جائیں گے''

اُن کی نظم ''سنبھل کر چلو'' حکمت عملی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''سنبھل کر چلو، قدم ناپو
چھپے ہیں ہزاروں راہ میں تضاد مشرب کے راہزن
دبوچ سکتے ہیں تمہیں کسی بھی بات کو لے کر''

ڈاکٹر شہزاد رضوی ہم خیالی کے حامی ہیں لیکن اُن کا یہ بھی نظریہ ہے جو اُن کی نظم ''ہم خیال'' سے ظاہر ہوتا ہے:

''بحث و مباحثہ وسعت خیالی کا سرچشمہ ہے
نئی دنیا کی تخلیق کا نقشہ ہے''

دین اور ایمان کے معاملے میں اُن کا نظریہ صاف ستھرا ہے۔ وہ ان سب برائیوں سے محفوظ ہیں جو انسان کے ایمان کو پراگندہ کرتی ہیں۔ اُن کی نظم ''اذان''، ''میرے رب''، ''میرا ایمان''، ''میری توبہ'' اور سرکار دو عالم ﷺ قابل ذکر ہیں۔ نظم ''میرا ایمان'' میں وہ کہتے ہیں:

''میری عبادت کوئی لین دین کوئی کاروبار نہیں
یہ میرے خالق کی محبت اور شکر گزاری ہے''

باپ بیٹی کا رشتہ بہت پیار کا ہوتا ہے، یہی پدرانہ شفقت اُن کی نظم ''میری بیٹی'' میں دکھائی دیتی ہے۔ اُن کی نظم ''عورت'' میں عورت کے انیک روپوں کو بڑی خوبصورت وضاحت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ اُن کی نظمیں ''چاند''، ''آفتاب''، ''اور'' دریا''، اُن کی وسعت نظری کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ''غم دوراں اور غم جاناں'' بہت ہی خوبصورت نظم ہے۔ شاعر نے بڑی خوبصورتی سے ایک چھوٹی سی نظم میں دو بڑے موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ نظم ''میں اور میخانہ'' میں طنز و مزاح کی ہلکی ہلکی پھوار ہے۔ مثال کے طور پر:

''کاش کہ واعظ دیکھ لیتا مجھے اِس صورت میں
میخانے میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہوں
شربت پی رہا ہوں
اور میرے ایمان کی محافظت ساقی کر رہا ہے''

گلستانِ اُردو اَدب میں دادِ سخن کے پھول برسانے کے ساتھ میری یہ آرزو ہے کہ چمن ادب میں شہزاد رضوی کے سخن کے سدا بہار پھول سدا مہکتے رہیں اور اس بہار کی کبھی خزاں نہ ہو۔ ☆☆☆☆

رخسانہ وسیم

اٹلانٹا، امریکہ

ڈاکٹر شہزاد رضوی کی اُردو شاعری

ڈاکٹر شہزاد رضوی خیرآباد کے اُس رئیس الوقت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس نے اپنے زمانے میں علم و فضل، شعر و سخن، ادب، فلسفہ و منطق میں وہ چراغ روشن کیے جن کی روشنی پوری دنیا میں پھیلی اور ملک کی جنگ آزادی میں جنہوں نے مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ ان ناقابل فراموش ہستیوں میں حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی، صاحبزادے حضرت عبدالحق خیرآبادی اور دختر نیک اختر محترمہ حرماں خیرآبادی کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد رضوی کے نانا حضرت مضطر خیرآبادی جو اپنے زمانے کے باکمال اُستاد شاعر گزرے ہیں، اُن کی اولادیں، حضرت برترؔ خیرآبادی، حضرت نشترؔ خیرآبادی، حضرت جاں نثارؔ اخترؔ کا نام اُردو شاعری میں اہم مقام رکھتا ہے۔

حضرت نشتر خیرآبادی کے فرزند ارجمند ڈاکٹر شہزاد رضوی کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ ڈاکٹر شہزاد رضوی کا مجموعۂ کلام ''چلتے چلتے'' اُردو ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ فلک پر بکھرے ہوئے رنگوں کی طرح ڈاکٹر رضوی کی شاعری بھی کئی رنگ رکھتی ہے۔ غم جاناں سے لے کر غم دوراں تک فکر و فن اپنا کمال دکھاتا ہے۔ ان کی نظموں میں عصر جدید کے مسائل اور اُن کا حل

ہے۔ اِسی کے ساتھ خواب غفلت سے بیداری، صحت مندانہ رجحانات، وسعتِ قلب و نظر، زندگی کی خوشحالی اور بہبودی، عالمانہ اور مخلصانہ ہدایتیں، بلند ترین اخلاقی نکات ذہنوں کے بند دریچے کھولتے ہیں اور فکر و نظر کی روشنی میں تاریکی سے نکاس کا راستہ دِکھاتے ہیں۔ اُن کی نظمیں ''کلیدِ زندگی''، ''سنبھل کر چلو''، ''قوتِ ارادی اور مقدرّ''، ''سچ اور جھوٹ''، ''چلتے چلتے'' اور ''چیونٹیاں'' اِس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد رضوی کی کچھ نظمیں حسن و عشق اور سوز و غم کے جذبے سے سرشار ہیں، حسن کی پاکیزگی اور عشق کی بے کلی کا جذبہ کارفرما ہے۔ جن میں ''ہمدم''، ''ملاقات''، ''غائبانہ محبت''، ''پیار کا موسم''، ''محبت کے رنگ''، ''عشق اور موت''، ''غم جاناں اور غم دوراں''، ''میں تم اور سمندر'' کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

دین اور ایمان کے سلسلے میں ڈاکٹر شہزاد رضوی کا نقطہ نظر بہت شفاف ہے جو خشوع و خضوع کے جذبہ سے منور ہے۔ اپنی نظم ''میرا ایمان'' میں وہ کہتے ہیں:

''میری دُعا مادّی چیزوں سے مبرّا ہوتی ہے
میری عبادت کوئی لین دین کوئی کاروبار نہیں
یہ میرے خالق کی محبت اور شکر گزاری ہے''

اپنی نظم ''سرکارِ دو عالم ﷺ'' میں بصد احترام اپنا نذرانۂ عقیدت وہ اِن الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''مجھے سرکارِ دو عالم ﷺ سے محبت ہے
یہ محبت اُن کی چشم ناز کی عنایت ہے''

اپنی نظم ''میرے رب'' میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی التجا پیش کرتے ہیں:

''میرے خدا! یہ ہے مری التجا
میری زمینِ دل میں
ایک بیج محبت کا ڈال دے
اور مجھے وہ کمال دے
کہ ایمان کی آبیاری سے
میں اُسے تناور درخت بنا سکوں''

اپنی کئی نظموں میں ڈاکٹر شہزاد رضوی نے بڑے خوبصورت پیغامات دیے ہیں، جیسا کہ وہ اپنی نظم ''چلتے چلتے'' میں کہتے ہیں:

''اگر تم اندھیروں سے لڑنا چاہتے ہو
تو اپنے دل کے اندر آفتاب روشن کرو''
ایک سورج دُنیا کے اندھیروں کو مٹانے کے لیے بہت کافی ہے''

ڈاکٹر شہزاد رضوی کے کلام میں ندرتِ فکر اور اسلوب بیان کی پیشکش بڑے دل پذیر انداز میں نظر آتی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ انگریزی اَدب کے خزانے کو اپنے ادبی شاہکار عطا کرتے ہوئے اُنہوں نے اُردو کی ذمہ داریوں کو فراموش نہیں کیا۔ اُن کا مجموعۂ کلام ''چلتے چلتے'' اس بات کا ضامن ہے۔ اُمید کرتی ہوں کہ آئندہ بھی وہ اُردو اَدب میں اپنے فکر وفن کے چراغ قدم قدم پر روشن کرتے رہیں گے۔

☆☆☆☆

سیدہ ناہید نشتر خیر آبادی

اٹلانٹا، امریکہ

فکر و فن کے شاعر ڈاکٹر شہزاد رضوی

ڈاکٹر شہزاد رضوی کا تخلیقی سفر انگریزی ادب کی موجوں سے کھیلتا ہوا، برفیلے پہاڑوں اور آبشاروں سے لطف اندوز ہوتا ہوا، فلک بوس عمارتوں کو چھوتا ہوا، دُنیا کے بڑے بڑے ممالک کی سیر کرتا ہوا، سیاست کو سمجھتا بوجھتا ہوا، تاریخ کے اوراق کو پلٹتا ہوا، حسنِ کائنات میں نئے نئے معنی اور زاویے تلاش کرتا ہوا، جب اُردو اَدب کی وادیٔ اُلفت میں پہنچا تو گلستانِ ادب میں کچھ اور ہی رنگ کے پھول کھل اُٹھے۔ یہ گلہائے سخن ڈاکٹر شہزاد رضوی کے فکر و فن کی حامل وہ دل نواز اور خوبصورت نظمیں ہیں جو اُن کے مجموعۂ کلام ''چلتے چلتے'' کی زینت ہیں۔ یہ نظمیں اپنے نئے رنگ، نئی خوشبو، نئے لہجے اور نئی اَدا و وضع سے اُردو شاعری میں نئی نئی سی کسی رہ گزر کا احساس دلاتی ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد رضوی کی یہ نظمیں زندگی کے ہر رنگ سے مانوس ہیں۔ ان میں ہماری تہذیب و تمدن کی بھرپور عکاسی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ضرورتوں کی اہمیت ہے، آج کے تعلیمی دور کی روشن خیالی ہے، حسن و عشق کی پاکیزگی اور اُس کا تقدس ہے۔ غم کی وسعت و گہرائی و گیرائی ہے، درد کی تڑپ ہے، پیار کے نغمے ہیں، خیالات و تخیلات کا حسن ہے، جذبات کی شدت ہے،

احساسات کی نزاکتیں ہیں، دلِ مضطرب کی کیفیتیں اور اُن کی سچی اور صحیح عکاسی ہے۔ اُن کی نظمیں ''ہمدم''، ''ملاقات''، ''ساز و آہنگ''، ''تم''، ''پیار کا موسم''، ''زندگی کے اوراق''، ''میں تم اور سمندر'' ان کی فنی صلاحیتوں کی غمازی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد رضوی کی نظموں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن میں زندگی کی اُلجھنوں سے فرار کا جذبہ قطعی نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کو خوش کن، خوشگوار اور خوش رنگ بنانے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ ان میں زندگی کی دھوپ چھاؤں کے فلسفے، عقائد کی خوبصورتی کی یادیں، حال کو بہتر بنانے کی فکر، مستقبل کو سنوارنے کی دُھن اور ہمت اور سوجھ بوجھ کے ساتھ حالات کو بدلنے کا جتن ہے، اپنی مادری زبان اُردو سے محبت ہے، اُس کی قدر و منزلت اور اپنی تہذیبی قدروں پر ناز اور فخر کا جذبہ ہے۔ ڈاکٹر شہزاد رضوی کی کئی نظموں میں دو متضاد خیالات کا دلکش اور خوبصورت موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں ''سچ اور جھوٹ''، ''غم دوراں اور غم جاناں''، ''روٹھنا منانا'' میں حسن بیان کا بڑا دلکش انداز ہے۔ ''غم دوراں اور غم جاناں'' میں وہ کہتے ہیں:

''کوئی خوش نصیب ہی ہوگا
جو دونوں میدانوں میں جنگ جیت جاتا ہوگا
ورنہ غم دوراں کا اژدہا
غم جاناں کی مچھلی کو نگل لیتا ہے
اور پھر زندگی ایک سمجھوتہ بن جاتی ہے۔''

ڈاکٹر شہزاد رضوی نے اپنی نظم ''عشق اور موت'' میں عشق اور موت کا موازنہ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ ایمان کی کسوٹی پر کھری اُترتی ہوئی اُن کی

نظمیں ''میرا ایمان''، ''اذان''، ''حمد''، ''میرے رب''، ''میری توبہ'' اور ''سرکارِ دو عالم'' اُن جذبات سے منور ہیں جو دلوں میں نیکی جگانے اور رزم خیر و شر میں خیر کی حکمرانی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد رضوی کی بہت سی نظموں میں ہمارے دور کی آواز اور وقت کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ عزم جواں اور حوصلہ مندی کے جذبات کی سرشاری کا بہترین نمونہ اُن کی نظم ''کلیدِ زندگی'' میں نظر آتا ہے۔

ایک حساس شاعر دنیا کے ناکام، مجبور اور مایوس لوگوں کے دلوں کو تسلیاں دیتا، اُن کی راہبری کرتا، اُن کی ہمت اور ڈھارس بندھاتا اور مایوس دلوں میں حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

''وقتِ رفتہ پہ آنسو کیوں بہاتے ہو تم
وقتِ حاضر پہ ذرا مسکرا کر تو دیکھو
اس کے آنچل میں بے شمار بہاریں ہیں
اُس پہ چمکتے ہوئے ہزارہا ستارے ہیں
اُس سے وابستہ ہیں زندگی خوشیاں
اُس میں پنہاں ہیں رموزِ فردا
اگر کلیدِ زندگی کی تلاش ہے تم کو
ذرا جھانکو اپنی روح کے اندر''

اپنی نظم ''چیونٹیاں'' میں وہ دنیا کے غافل اور کم سمجھ لوگوں کو چیونٹیوں ہی سے جینے کا سلیقہ اور ہنر سیکھنے کی تلقین کرتے دکھائی دیتے ہیں:

''کاش کوئی دُنیا کے لوگوں سے یہ کہہ دے

چیونٹیوں ہی سے سیکھ لیں جینے کا ہنر
اور طے کریں اپنی زندگی کا عزم سفر"

اپنی نظم "چلتے چلتے" میں وہ آج کے ظلم و تشدد کے شکار معصوم اور مظلوم لوگوں کو ایک عظیم پیغام دیتے ہیں:

"اگر اندھیروں سے لڑنا چاہتے ہو تم
اپنے دل میں ایک آفتاب روشن کرو
ایک سورج دُنیا کے اندھیروں کو مٹانے کے لیے بہت کافی ہے۔"

بلا شبہ ڈاکٹر شہزاد رضوی کا مجموعۂ کلام "چلتے چلتے" ایک حساس شاعر کا اُردو ادب کو خوبصورت تحفہ ہے جس کی قدر و منزلت اس لیے بھی ضروری ہے کہ اُن کی شاعری بہتے دریا کے دونوں کناروں یعنی انگریزی اور اردو کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے۔ اور وہ نہ صرف انگریزی اور اُردو کے ایک اچھے شاعر اور اچھے ادیب ہیں بلکہ ایک بہت اچھے انسان بھی ہیں۔

خدا اُن کی زندگی کے سفر میں یوں ہی کامیابیوں و کامرانیوں کے کرمِ خاص سے نوازے تاکہ وہ ادب و شعر کے ذریعہ پیغام محبت دنیا کو سناتے رہیں۔

☆☆☆☆

سید ضیاء خیر آبادی

اٹلانٹا (امریکہ)

ڈاکٹر شہزاد رضوی کی کائناتِ سخن

میں شہزاد رضوی کی انگریزی دانی سے بہت مرعوب تھا لیکن جب اُنہوں نے اُردو اَدب میں قدم رکھا تو واقعی میرا دل اُن کے فکر وفن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُن کے مجموعۂ کلام ''چلتے چلتے'' میں شامل اُن کی بصیرت افروز نظمیں، اُن کے نازک احساسات، اُن کے عالمانہ خیالات، اُن کے شاعرانہ جذبات اور وسیع مشاہدات کی آئینہ دار ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد رضوی مشرق اور مغرب کے شاعر ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد رضوی کے کلام کی بڑی خوبی اُن کے موضوعات ہیں جو اُن کے وسیع مطالعہ اور مشاہدات پر مبنی ہیں۔ اُن موضوعات کو اُنہوں نے جذبات اور خیالات کے سانچے میں ڈھال کر جو بات کہی ہے وہ نظموں کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ ''گاگر میں ساگر'' کی طرح اُن کی چھوٹی چھوٹی نظموں میں بڑی بڑی باتیں کہی گئی ہیں۔ ان میں مشرقی سادگی، سچائی، حق گوئی، معصومیت، دلکشی گہرائی اور سنجیدگی ہے تو دوسری طرف مغرب کے فن کی روانی اور تیز رفتاری ہے۔ ان نظموں میں زندگی کی تلخی، ماضی کی یادیں، حسن وعشق کی باتیں، نفسیات، عقائد، فلسفے اور غور وفکر ہے۔ ان نظموں کا لہجہ نیا ہے، زبان اور بیان میں شیرینی، دلکشی اور نغمگی ہے، کہیں

کہیں زبان اتنی سادہ ہے کہ لگتا ہے کہ بات چیت کر رہے ہیں۔ کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ کا بھی اِستعمال ہے، خوبصورت استعارات اور تشبیہات کا بھی سہارا لیا ہے، اپنی بات کو بیان کرنے کے لیے۔ دین اور ایمان کے معاملے میں اُن کے عقائد بہت راسخ ہیں، وہ ایک سچے اور اچھے انسان ہیں، اُن کے فکر وفن پر ایک طرف مغرب کا بھرپور تاثر ہے تو دوسری طرف اُن کے دل کی مسجد میں اذان گونج رہی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی نظمیں ''اذان''، ''میری توبہ''، ''میرے رب''، ''سرکار دو عالمؐ'' اور ''میرا ایمان'' قابل ذکر ہیں۔ اُن کی نظمیں کہیں پر تو اُن کے معصوم دل کی عکاسی کرتی ہیں تو دوسری طرف غور وفکر کرنے والے ذہن کی ترجمان ہیں۔ اکثر نظموں میں وہ عام انسانیت کے دکھوں کا مداوا تلاش کرتے اور حوصلوں کو جگاتے نظر آتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شہزاد رضوی کی یہ سعی مشکور ہوگی اور ''چلتے چلتے'' کا اردو دُنیا میں تپاک کے ساتھ خیر مقدم کیا جائے گا۔

☆☆☆☆

نظمیں

حمد

اے خدائے عزّ و جل
تیری توحید کی
اس سے بڑی کیا شان ہے
تیری عبودیت کی اس سے بڑی کیا پہچان ہے
عالم کی ہر شے
تیرے آگے سجدہ ریز ہے
ملائک اور فرشتے
تیرے حکم کے غلام ہیں
تیرے جلوے کی مظہر
ہے ہر شے کائنات کی
یہ بڑے بڑے سمندر
یہ گھنے جنگل
یہ دور تک پہاڑوں کے پھیلے ہوئے سلسلے
یہ دشت وصحرا کے دراز فاصلے

یہ منظر تا حدِ نگاہ
ہیں تیری عظمتوں کے گواہ
بیج سے اُگیں جو پھل
ہزار ہا مزے ہیں
جو پھول کھلیں طرح طرح کے
ہزار ہا رنگ ہیں
جنہیں دیکھ کر بشر کی
عقل و خرد سب ہی دنگ ہیں

تتلیوں کو کس نے
رنگ رنگ سے رنگ دیا
یہ جوڑے بنا کے کس نے
محبتوں کا ڈھنگ دیا
عشق کا سلسلہ
یہ کس نے جگا دیا
وفورِ شوق میں شمع کے
پروانے کو کس نے مٹا دیا
چکور کے دل میں چاند کا

پیار کس نے جگا دیا
گل کے پیچھے بلبل کو
کس نے لگا دیا

ہر جگہ تیری شان ہے
ہر جگہ تیری آن ہے
اِسی پہ غور کرنا
تیری حمد ہے
اِسی پہ غور کرنا
تیری ثنا ہے

○

سرکارِ دو عالم ﷺ

مجھے سرکارِ دو عالم ﷺ سے محبت ہے
یہ محبت اُن کی چشم ناز کی عنایت ہے
حسن سیرت اور حسن صورت میں
نہیں ہے آپ ؐ کا کوئی بھی ثانی

آپ کی زیست کا ہر لمحہ
ہے تفسیر قرآنی، ہے تنویر رحمانی
صبر اور شکر
آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا
زہد و تقویٰ
آپ کی زندگی کا قرینہ تھا

حبیبِ خدا ہیں جانِ رحمت ہیں
سراپا محبت ہیں، سر تا پا رحمت ہیں

سرتاجِ اُولیاء ہیں، سردارِ انبیاء ہیں
سیّدالبشر ہیں، شافع محشر ہیں

احسان آپ کا امت پہ بھاری ہے
فیضان آپ کا
تا قیامت جاری ہے
میرے لاکھوں درود و سلام
شہنشاہِ دو عالم ﷺ پر
میرے لاکھوں دَرود و سلام
سرکارِدو عالم ﷺ پر۔

○

میرے رب

میرے رب!
کرم کر، کرم کر
رحم کر، رحم کر
بخش دے، بخش دے

تیری بندگی کا کوئی عمل
نہ میرے پاس ہے
مجھے اپنی کوتاہیوں کا
بہت احساس ہے
خطا کار ہوں
بہت شرمسار ہوں

نہ بنا مجھے نفس کا غلام
نہ کر شیطان کو میرا ہمسفر

میرے خدا! یہ ہے میری التجا

میری زمینِ دل میں

ایک بیج محبت کا ڈال دے

اور مجھے وہ کمال دے

کہ ایمان کی آبیاری سے

میں اِسے ایک تناور درخت بنا سکوں۔

○

اذان

اگر دعوت نامہ نہ ملے، لوگ شاکی ہوجاتے ہیں
اکثر تعلقات خراب ہوجاتے ہیں
لیکن جب اذنِ خدا ملتا ہے
مؤذن اذان دیتا ہے
عبادت کی دعوت دیتا ہے
لوگ اپنی نیند میں گم رہتے ہیں
گر کانوں میں آواز پہنچ بھی جائے
اپنی سماعت کا گلا تکیے سے گھونٹ دیتے ہیں
کروٹ لے کر پھر نیند میں غائب ہوجاتے ہیں
کیا یہ اپنے رزّاق اور خالق کی شکر گزاری ہے؟
آنکھیں کھولیں اور اپنے فرض کو پہچانیں
اور پڑھ لیں چار رکعت نماز۔

○

چلتے چلتے

چلتے چلتے
زندگی کے پُرخطر راستے میں
مجھ کو ملے عجیب غریب منظر
ٹھاٹھیں مارتے غضب ڈھاتے ہوئے سمندر
گھنے خوفناک گنجان جنگل
دور تک بے حس پہاڑوں کے پتھریلے سلسلے
اور دامن بچاتے خودسر دَریا
بجلیاں ہر نشیمن کو تکتی ہوئیں
قہر آلود فضائیں زہر اُگلتی ہوئیں
دہشت و وحشت کے پھیلے ہوئے طویل سائے
بھوک اور اِفلاس کے ناگ لوگوں کو ڈستے ہوئے
جد و جہد، ناکامی کے ساحل پر سر پٹکتی ہوئی
مایوسی اُمنگوں اور آرزوؤں کا گلا گھونٹتی ہوئی
شیطانی طاقتیں ابنِ آدم کو ذبح کرتی ہوئیں

فلک شگاف آہ و بکا سے سینے پھٹتے ہوئے
بستیاں کھنڈروں میں بدلتی ہوئیں
خون پانی کی طرح جگہ جگہ سڑکوں پر بہتا ہوا

میں نے گھبرا کر تڑپتے ہوئے
اپنے احساسات کو، اپنے جذبات کو
اپنے مشاہدات کو، اپنے تاثرات کو
اپنی مٹھی میں بند کر لیا
فکر و فن کے چند جگنو، میری مٹھی میں چمکنے لگے
اور مجھ سے کہنے لگے
شب کی اس تیرگی کو ہم مٹا سکتے نہیں
اگر تم ان اندھیروں سے لڑنا چاہتے ہو
تو اپنے دل کے اندر آفتاب روشن کرو
ایک سورج دُنیا کے اندھیروں کو مٹانے کے لیے بہت کافی ہے۔

○

غائبانہ محبت

جب بھی گزرتا پسِ چلمن کوئی میرے شعر گنگناتا ہوا
میں نے سوچا کوئی میرا مدّاح ہوگا
شاعروں کے لئے یہ کوئی اجنبی بات نہیں
اِس کا سلسلہ کافی عرصہ تک رہا
میں نے دوستوں سے اِس کا ذکر کیا
وہ گئے یکے بعد دیگرے اس کی تصدیق کرنے
لیکن وہ سب لوٹ آئے مایوس ہوکر
بولے گر تمہاری خوش فہمی اور بھی حد سے تجاوز کرتی ہے
بیابانوں میں پرند و جانور بھی تمہارے شعر گنگنانا شروع کردیں گے
میں نے خاموشی میں عافیت سمجھی اور حسب دستور پھر وہاں سے گزرا
نہ تو چلمن تھی اور نہ ہی کسی کی آواز سُننے میں آتی تھی
بہت پس و پیش کے بعد دروازے پر دستک دی
ایک پریشان حال معمّر خاتون نے دروازہ کھولا
بولیں میری بیٹی رات دن تمہارے لئے تڑپتی تھی

نہ کھاتی تھی اور نہ ہی سوتی تھی
اُسے بڑی آس تھی کہ ایک دِن تم آؤ گے ضرور
اب تم آئے تو ہو لیکن بہت تاخیر کر کے
میری بیٹی کے چلے جانے کے بعد
وہ اللہ کو پیاری ہوگئی۔

اور میں بوجھل قدموں سے واپس گھر لوٹ گیا۔

○

کلید زندگی

وقتِ رفتہ پہ آنسو کیوں بہاتے ہو تم
وقتِ حاضر پہ ذرا مسکرا کر تو دیکھو
اس کے آنچل میں بے شمار بہاریں ہیں
اِس پہ چمکتے ہوئے ہزار ہا ستارے ہیں
اس سے وابستہ ہیں زندگی کی خوشیاں
اِس میں پنہاں ہیں رموزِ فردا
اگر کلیدِ زندگی کی تلاش ہے تم کو
ذرا جھانکو اپنی روح کے اندر
ہزار ہا راستے منتظر ہیں تمہارے قدموں کے
تم نے اوروں پہ بہت وقت ضائع کیا
تم نے سمجھا کہ یہ عقدہ کشائی کسی اور سے ہو گی
زندگی کے حل ملیں گے دماغی ماہروں سے
تمہارا کام بن جائے گا کسی کے مشوروں سے
تم نے اس خیال میں کمزور کیا اپنی سمجھ کو

اپنی ذات کے سرمائے کو حقارت سے دیکھا
تم کو دور کے ڈھول اِتنے سُہانے لگے
کہ تم بھاگے اُن کی طرف بلا سوچ سمجھے
اِس تگ و دو میں چھوڑ گئے سارا اثاثہ اپنا
ہوش میں آؤ اور اب ذرا آنکھیں کھولو
صلاحیتیں تمہاری کب سے بیتاب ہیں
تمہارا خیر مقدم کرنے کے لیے
ان سے گلے ملو اور اپنی زندگی کو بدلو
اِس میں اَب تاخیر بالکل نہیں ہونا ہے
تم نے یہ سُنا تو یقیناً ہوگا
گر صبح کا بھولا ہوا شام کو لوٹے
اُسے بھٹکا ہوا ہرگز نہیں کہتے۔

○

مغرب کی ریت

یہاں ساس کی حکومت نہیں چلتی

یہ ہے امریکہ، یہاں بہو کا بول بالا ہے

یہاں لفظ سُسرال لغت میں ہے ہی نہیں

یہ تصوّر ہی یہاں بہت نرالا ہے

یہ تہذیب پیام و سلام کی رسم سے مبرّا ہے

یہاں نوجوان خود ہی ایک دوسرے سے ملتے ہیں

ایک دوسرے کو سمجھتے پرکھتے ہیں

ڈیٹنگ بہت استعمال ہوتی ہے اِس مقصد سے

ہم بود و باشی بھی ہے اِک عظیم آلۂ پیما

گر کہیں بات پہنچ جائے رسم ازدواجی تک

تو نہ دِنوں ڈھول بجتے ہیں، نہ میراثنیں گاتی ہیں

اور نہ ہی مہمانوں سے گھر بھر جاتے ہیں

اور نہ ہی دِنوں اُبٹنے اور مہندیاں لگتی ہیں

یہاں تو معاملہ بہت سیدھا سادا ہے

دُلہن خود بازار کے گشت لگاتی ہے

اور ساز و سامانِ عروسی پہ نظر جماتی ہے
بہت تگ و دو کے بعد
سامانِ ضروری اور لباس عروسی خرید لاتی ہے
عقد کے لیے کوئی گرجا، کوئی کلیسا، کوئی پادری ضروری نہیں
اس عمل نیک کو کوئی بھی کہیں بھی تکمیل دے سکتا ہے
پھر دیگ پہ دیگ نہیں چڑھتے ہیں
کھانے کمپنیاں پکاتی اور کھلاتی ہیں
بڑی محفل میں دُلہا دُلہن رقص کرتے ہیں
اپنے اعزّا اور مہمانوں کو محظوظ کرتے ہیں
یکے بعد دیگرے رُخصت ہوتے ہیں لوگ
کمپنی اپنا خیمہ اُکھاڑ لیتی ہے، اپنے برتن بٹور لیتی ہے
جب شام ہوتی ہے اپارٹمنٹ میں سناٹا ہے
دُلہن نہیں بیٹھی مسہری پر زیورات سے لیس گھونگٹ کر کے
نہ دولہا داخل ہوتا ہے دبے پاؤں دِل میں دھڑکن لے کر
دونوں ایک دوسرے کے جانے پہچانے ہیں
چونکہ عرصہ سے باہم بود و باشی میں ہیں مصروف
رات کسی اور رات سے مختلف نہیں۔

○

میرا ایمان

کون کہتا ہے کہ میں ہوں مذہب سے منکر
اذان علی الصبح میرے کانوں تک پہنچ جاتی ہے
اس سے قبل کہ دوسرے اہلِ ایماں آنکھیں کھولیں
میں بصد خضوع و خشوع سجدے میں گر جاتا ہوں
میری دعا مادّی چیزوں سے مبرا ہوتی ہے
میری عبادت کوئی لین دین، کوئی کاروبار نہیں
یہ میرے خالق کی محبت اور شکر گزاری ہے۔

○

ہمدم

منزل کہاں ہے، کدھر ہے مجھے کچھ نہیں معلوم
راہ چلتے کچھ لوگ منزل کی نشاندہی کر دیتے ہیں
اور میں منزل کی طرف گامزن ہو جاتا ہوں
وہ نقوش، وہ نشان، وہ پتے مجھ کو بھٹکا دیتے ہیں
میں برسوں مارا مارا پھرتا ہوں
ہزار ہا مصیبتوں سے دوچار ہوتا رہتا ہوں
راہزن میرا زادِ راہ لوٹ لیتے ہیں
میں پریشان حال، دِل شکستہ، دِل برداشتہ بالآخر لوٹ آتا ہوں
تمام اُمیدیں مجھے تنہا چھوڑ کر چلی جاتی ہیں
پھر ایک سُریلی آواز عالمِ نیم ہوشی میں سنتا ہوں
سمجھتا ہوں یہ ایک خیالِ خام ہے، یہ ایک حسیں خواب ہے
کسی کا ہاتھ اپنے کاندھے پر محسوس کرتا ہوں
ایک حسین دوشیزہ کو اپنے مقابل پاتا ہوں
کہتی ہے کیا تمہیں ہمسفر کی ضرورت ہے؟

ہم ایک دوسرے کے غمگسار ہمدم ہو سکتے ہیں
راہ کی صعوبتیں ایک ساتھ جھیل سکتے ہیں
ایک دوسرے کی رہبری کر سکتے ہیں
مجھے احساس ہوتا ہے یہ کوئی خواب و خیال نہیں
میری ساری کلفتیں دور ہو جاتی ہیں
میری آرزوئیں اور تمنائیں ایک نیا رنگ لے لیتی ہیں
اور میں نئے عزم سے ہمسفر کے ساتھ
منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہوں۔

○

محبت ہماری زبان ہے

محبت کیا ہے اِس کو ہمیں سمجھتے ہیں
انگریزوں کو صرف مشینیں بنانا آتا ہے
فرانسیسی زبان میں ہے صرف ایک لفظ
وہ پسند اور محبت دونوں کے لئے اِستعمال ہوتا ہے
اُردو میں ہم ہر رنگ اور جذبے کی شدت کو بیان کر سکتے ہیں
پسند، اُنسیت، پیار، محبت، عشق جیسے الفاظ ہیں ہماری زبان میں
ان کا استعمال ہم بہت سوچ کر کرتے ہیں
ہماری زبان ہر گھڑی ہر قدم محبت کے گیت نہیں گاتی
اس جذبہٗ اعلیٰ کو بازارِ احساسات میں سستا نہیں کرتی
ہر موقع، ہر محل اور کشش و جذبہ کے لحاظ سے لفظ کی آمد ہوتی ہے
ہماری تہذیب میں اس طرح الفاظ اور جذبات مل کر کام کرتے ہیں
اُردو کے سہارے ہم مختلف رِشتوں میں بندھ جاتے ہیں
مادّی اختراعات میں چاہے ہم بہت پیچھے ہوں
جذبوں کی دوڑ تو ہم کب کے جیت چکے ہیں

○

ساز اور راگ

ساز کیوں نہیں چھڑتا
دل کے تار ٹوٹ گئے ہیں کیا
کوئی ڈھونڈے اُن کو جوڑنے والا
زندگی تھم سی گئی ہے اِس وقت
کان گونج رہے ہیں راگوں سے
ذہن لبریز ہے خیالوں سے
میں لرزہ بہ اندام ہوں جذبات کے اُبھرنے سے
میں واقف نہیں رموزِ موسیقی سے
صرف یہ جانتا ہوں محبت اور راگ چولی دامن کے ساتھی ہیں
میں منتظر ہوں کہ دِل کے تار کوئی جوڑ دے
اور محبت کا راگ پھر ۔چھڑ جائے۔

○

تم اور تمہارا تصوّر

تنہائی کیوں ستائے مجھے
جب کہ تم میرے پاس ہوتی ہو ہر وقت
گر جسم نہ ہو، نہ سہی، یادیں تو ہوتی ہیں
وہ اپنے حسین لمحات میں گم کر دیتی ہیں
خود کو بھول کر، حال کو چھوڑ کر، ماضی میں چلا جاتا ہوں
اپنے تصوّر میں اپنی یادوں کو اور بھی دلکش بنا لیتا ہوں
پھر تم نہ جانے کہاں سے چپکے سے،
میرے عالم وجود میں داخل ہوتی ہو
اور مجھ کو ماضی سے کھینچ کر حال میں لے آتی ہو
میں خیالی تم کو اور حقیقی تم کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہوں
یہ فیصلہ ممکن نہیں ہوتا کہ تم میں زیادہ کون دلکش ہے
بالآخر تصوّرات کی دُنیا کا دروازہ بند ہو جاتا ہے
اور میں نئی یادوں کی تعمیر میں پھر لگ جاتا ہوں۔

○

دولت

میں دولت کی طاقت سے منکر نہیں ہوں
اِس کا حق و باطل کے نشاں مٹانا بُرا لگتا ہے
لوگ کیا کیا جتن کرتے ہیں اِس کو حاصل کرنے میں
یہاں تک روح اور جسم کے سودے کر لیتے ہیں
اُس کے حکم پر زمین اور آسمان اُٹھا لیتے ہیں
اُس کے ایما پر اپنا ایمان لُٹا دیتے ہیں
حیف ہے کتنی بھی ملے کم ہی معلوم ہوتی ہے
برا لگتا ہے اُس کا حق و باطل میں تفریق کرنا
برا لگتا ہے اُس کا حق کے خلاف باطل کا ساتھ دینا
ختم کب ہوگی اِس کی حکومت ہم پر
کب دور ہوگی اِس کی ظلمت ہم سے
اور کب ہو جائے گی ہماری قدروں کی درخشاں صبح۔

○

عشق کے جادوگر

چمن میں عشق کے جادوگر چھپے رہتے ہیں
نکل آتے ہیں فوراً کسی حسینہ کو دیکھ کر
اُن کی باتیں معصوم دل پر سحر کا کام کر دیتی ہیں
اُن کی نظریں حسین دوشیزہ کو اسیرِ دام کرلیتی ہیں
پھولوں کی مہک ، چاند کی چمک، ستاروں کی دمک
اُس پر اک عجیب سا کیف طاری کر دیتی ہے
پُرکشش موسیقی اُس کے اعصاب کو ساکت کر دیتی ہے
ساحر کی میٹھی باتیں اور محبت کے وعدے سُنتے سُنتے وہ گہری نیند سو جاتی ہے
جب اُس کو ہوش آتا ہے
خود کو تنہا اِک ریگستان میں پاتی ہے
نہ ساحر، نہ اُسکی محبت اور وعدے ، نہ چمن، نہ چاند اور نہ ستارے دِکھائی دیتے ہیں
کیا وہ حقیقت تھی یا خواب؟
وہاں کوئی نہیں اُسے سمجھانے کے لئے۔

○

چاند

چاند صدیوں سے ہماری تہذیب کا گہوارہ ہے
ہمارے بچوں نے اُسے چندا ماموں کہہ کر پکارا ہے
عاشقوں نے دیکھا ہے محبت بھری نظروں سے اُسے
شاعروں نے اکثر شاعری کا موضوع بنایا ہے اُسے
جب وہ نکلتا ہے تو تاریک زمین چمک اُٹھتی ہے
اور بھٹکے ہوئے مسافروں کو منزل کی نشاندہی ہو جاتی ہے
اور جب وہ چھپ جاتا ہے اِک اُداسی سی دِل پہ چھا جاتی ہے
روزہ داروں کے لئے وہ عید کا پیغام لے آتا ہے
مدّ و جذر لا کر وہ دریا سے بھی کھلواڑ کر لیتا ہے
کشتیوں کو وہ ساحل تک پہنچنے کا موقع بھی دیتا ہے
اس کی چھاؤں میں محبتیں پروان چڑھا کرتی ہیں
ایک دِن اُس تک رسائی ہو جائے گی، یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے ہم
اُس کے کھینچ کر لے جانے کو ہم اپنا کارنامہ سمجھ بیٹھے ہیں
اب چاند سے ہمارا رشتہ کچھ بدلا بدلا دکھائی دیتا ہے
کاش یہ دسترس ہم کو کبھی بھی نہ ملی ہوتی۔

○

عشق اور موت

عشق اور موت کا موازنہ کیا کروں
یہ الگ الگ شاخوں کے پنچھی ہیں
عشق میں انسان کسی پر مرتا ہے
موت انسان کو مارتی ہے
عشق خَلوت میں زار زار روتا ہے
موت پر لوگ مل کر ماتم کرتے ہیں
عشق میں انسان بارہا مرتا ہے
موت اُس کو صرف ایک بار آتی ہے
عشق وہ روگ ہے جس کا علاج ممکن ہے
موت وہ مرض ہے جس میں شفا نہیں ہوتی
موت کا دن مقرّر ہے
عشق کسی بھی وقت ہو جاتا ہے
عشق کا لطف و سوز ہے معلوم
موت کا درد بتانا ممکن ہی نہیں
عشق میں جب جان چلی جاتی ہے
موت اور عشق ایک سنگم پر مل جاتے ہیں

○

ملاقات

تم سے ملاقات کا لمحہ
منسلک ہے میرے اعصاب میں
ایسا لگتا ہے کل ہی کی بات ہے
گو کہ برسوں گذر چکے ہیں اسے
تمہارا آ کے بیٹھ جانا نیچی نظریں کر کے
اور گفتگو میں شرکت آہستہ آہستہ
پھر بات آگے بڑھتی ہی گئی
گھنٹے گذر نے لگے اِک پل میں
کوئی بھی بات جب چھڑ جاتی تھی
اُس کی انتہا نظر نہ آتی تھی
کوئی بھی راگ جب چھڑ جاتا تھا
دل و جاں ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے

لفظ محبت کبھی بھی زبان پر نہ آیا

ذکرِ مستقبل کبھی موضوعِ گفتگو نہ بنا

حال ہی میں اتنی کشش تھی

کہ ماضی کو ضم کرلیا اُس نے

جذبات اس منزل تک پہنچ چکے تھے

کہ لفظ محبت اُن کا اظہار نہ کر سکا

اب وہ لمحات محفوظ ہیں یادوں میں

وقت گزرنے کے ساتھ اُن کی شدت بڑھتی جاتی ہے

اب وہ ماضی حال بن گیا ہے میرا

اکثر سوچتا ہوں

کیوں نہ کہا میں نے جو کہ کہہ سکتا تھا

کیوں نہ کیا میں نے جو کرسکتا تھا

اَب اکثر تم سے مخاطب ہوکر کہہ دیتا ہوں

مجھ کو محبت ہے تم سے، کیوں نہ زندگی اِک ساتھ گزاریں، ہم تم۔

○

سچ اور جھوٹ

سچ وجھوٹ ایک ہی سکّے کے دو پہلو ہیں
اِس سکّے کو ہم جیب میں لیے پھرا کرتے ہیں
یہ وہ سکّہ ہے جو نہ تو بینک لیتا ہے اور نہ ہی اِس کی مال فروش قدر کرتے ہیں
یہ صرف ہمارے اخلاق اور ایمان کی نشاندہی میں کام آتا ہے
جب ہم حالتِ تذبذب میں اس کی طرف مائل ہوتے ہیں
دروغ و راست دونوں قبولیت کے متمنّی نظر آتے ہیں
یہ لمحہ ءفکر یہ ہماری شخصیت بن جاتا ہے
کبھی کبھی سچ اور جھوٹ کے درمیاں ایک دُھند سی طاری ہوجاتی ہے
گنگا کبھی سیدھی اور کبھی اُلٹی بہنے لگتی ہے
سیاست میں حق و باطل کا اِمتزاج ایک خصوصیت کا حامل ہوتا ہے
لہٰذا سیاست داں بعد از انتخاب اپنا سُر ہی بدل دیتے ہیں
دروغ گوئی اکثر سود مند ثابت ہوتی ہے
اِس سے دولت کی جھنکار اور عہدے کی پکار سُننے میں آتی ہے
ابن الوقت جب مصروف رہتے ہیں زادِ آدم کی گمراہی میں
حق گو روشنی کا مینار بن کر اندھیروں پہ چھا جاتے ہیں
وہ بھٹکے ہوئے انسانوں کے جہازوں کو ساحل کی طرف لے آتے ہیں۔

○

حق و باطل

یہ حق ہے کہ حق ہے صراطِ مستقیم
اور باطل ہے جھوٹ، لغو، ناحق ذلیل و کمین
لیکن حق اور باطل میں امتیاز
کبھی کبھی ایسے مٹ جاتا ہے
جیسے سمندر ساحل کو غرق کردے اپنی موجوں میں
لیکن پانی سمٹنے پر ساحل پھر اُبھر آتا ہے
لوگ ڈھونڈ لیتے ہیں باطل کے ذریعے جاہ و ثروت
باطل کے راستے آسان اور پُرکشش معلوم ہوتے ہیں
لیکن حق کو امتحان پر امتحان دینا پڑتے ہیں
حق سبز باغ نہیں دکھاتا اپنے چاہنے والوں کو
باطل کو چسکا رہتا ہے ظلم، تشدد اور جنگوں کا
حق کوشاں رہتا ہے اُمن و امان کا
اکثر باطل کی فتح اور حق کی شکست ہوتی ہے
لیکن حق کی یہ شکست عارضی ہوتی ہے

باطل سَراب کی طرح ہوتا ہے
باطل کی چمک عارضی اور بے حقیقت ہوتی ہے
جبکہ حق کا نور دائمی ہوتا ہے
باطل کے راستے پھول بھرے ہوتے ہیں، منزل خوفناک ہوتی ہے
حق کے راستے پتھریلے ہوتے ہیں منزل تابناک ہوتی ہے۔

○

کوئی ساز تو چھیڑے

کوئی ساز تو چھیڑے

مرا دل کب سے ہے بیتاب گیت گانے کو

میں گلوکار نہیں ، نہ سہی

میری روح رچی ہے نغموں سے

جب میں مدہوش سا ہو جاتا ہوں

میری ہر سانس گیت بن جاتی ہے۔

○

زندگی کے اوراق

میری جانم میں نے اکثر کہا ہے تم سے
میری زندگی کے اوراق بھرے پڑے ہیں آہوں سے
اُن کے پڑھنے سے رنج ہی ہوگا تم کو
وہ کتاب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے تو اچھا ہے
تم نے آکر ایک نئی زندگی دی ہے مجھ کو
میرے لمحات کو بھر دیا ہے خوشیوں سے
اپنی تاریخ اب کیوں نہ ازسر نو لکھ لیں۔

○

آفتاب

آفتاب کی وفاداری کیا کہیے
نکل آتا ہے ہر صبح مشرق سے
کہتے ہیں کہ وہ صرف آگ کا بگولا ہے
یہ اگر ناسمجھی نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
اُس کی شعاعیں راحت بخش ہیں، زندگی بخش ہیں ہمارے لئے
جان ڈال دیتی ہیں وہ کھیتوں میں باغوں میں، انسانوں میں
اُنہیں پر منحصر ہے تغیرِ موسم
بارانِ رحمت کر کے وہ حکم خدا بجا لاتی ہیں
اُن کی آمد سے پرندے چہک اُٹھتے ہیں، لالہ زار مہک اُٹھتے ہیں
بستیاں جاگ اُٹھتی ہیں
اگر وہ نہ آئیں تو اندھیرا ہی اندھیرا چھا جائے
اور زندگی ختم ہو جائے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

○

یادِ دورِ رفتہ

میری باتیں اکثر ہوتی ہیں ایک صاحب سے
اُن کو بے شمار شکایتیں ہیں دورِ حاضر سے
اُنہوں نے اُن کی لمبی چوڑی فہرستیں بنا ڈالی ہیں
لیے پھرتے ہیں اُن کو ہر وقت اپنی جیبوں میں
کہتے ہیں کہ اَب سارا زمانہ مائلِ تخریب ہوتا جا رہا ہے
اب لطف انسانوں میں، گانوں میں، کھانوں میں کم ہوتا جا رہا ہے
پائیداری، وضع داری عنقا ہو رہی ہے ہماری سرزمین سے
اَب تو ہر سانس پہ انسان بدلتے ہیں، فیشن بدلتے ہیں، ایمان بدلتے ہیں
اَب عہد رفتہ کی قدریں صرف کتابوں یا خوابوں میں ملتی ہیں
میں نے نرمی سے کہا دُنیا کا دستور ترقی ہے، تبدیلی ہے
جھلاّ کے بولے اِیسی ترقی چولے بھاڑ میں جائے
جس سے جانی پہچانی زندگی اجنبی ہو کے رہ جائے
اَب موٹر کار میں وہ بات کہاں جو تانگے کی سواری میں ہوا کرتی تھی
ای میل میں وہ قربت کہاں جو ہاتھ کے لکھے خطوں میں ملا کرتی تھی

اب تو شامیں چھین لی ہیں کمپیوٹر نے، ٹی.وی. نے
اب لوگ مل کے بیٹھتے ہی نہیں، باتیں کرتے ہی نہیں
فنِ گفتگو نوجوانوں کو آتا ہی نہیں
میں نے رضامندی میں ہی عافیت سمجھی
کہا خان صاحب آپ بجا فرماتے ہیں
اُن کو خیرباد کہہ کر اپنی جدید کار میں داخل ہوا
اپنی بیوی کو ٹیکسٹ کیا
اور پھر جی. پی. ایس. کے سہارے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

○

روٹھنا ، منانا

آپ تو بات بات پر روٹھ جاتی ہیں
میں نے بارہا کہا کہ مجھے منانا نہیں آتا
گذشتہ رات میں سو نہ سکا
یہ بات ساری رات مجھ کو ستاتی رہی
قریب صبح مجھے اِک حل سوجھا
کیوں نہ میں روٹھا کروں اور آپ مجھ کو منایا کریں
اِس سے مجھ کو تربیت مل جائے گی منانے کی
اِس کے پیچیدہ نکات و رموز مجھ پر روشن ہو جائیں گے
پھر مجھے کوئی دِقت نہیں ہوگی آپ کو منانے میں
اور میرا منانا آپ کے منانے کی عکاسی ہوگا
گو کہ اس معاملے میں مجھے ایک بڑا خدشہ ہے
کہیں ایسا نہ ہو کہ روٹھنا میرا شعار بن جائے
اور آپ کا کام ہمیشہ کے لئے مجھ کو منانا ہو جائے۔

○

وقت

وقت ازل سے ہمارا ساتھی رہا ہے
لیکن وقت کو ہم نے سمجھا ہی نہیں
گو کہ اِس کو ناپنے کے لئے ہم نے آفتاب اور ستاروں سے
مدد لی ہے
بہت سی کہاوتیں بنا ڈالیں اِس سے منسوب کر کے
کہا جاتا ہے کہ وقت کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا
وقت موجود تھا اُہم واقعات اور حادثات کے واقع ہونے پر
اُس نے حقیر انسانوں کو تاجپوشی کرتے دیکھا ہے
اُس نے ظالم شہنشاہوں کو سولی چڑھتے دیکھا ہے
اُس کے دل میں محفوظ ہے ہماری تاریخ
لیکن کچھ قومیں اُس کی عزت و توقیر کرتی ہی نہیں
وقت ضائع کرنا اُن کا قومی وتیرہ ہے
گو کہ وقت اور کام چولی دامن کے ساتھی ہیں
لیکن یہ رشتہ ہر ملک میں رنگ بدلتا ہے

کچھ لوگ اِس کی اتنی قدر و منزلت کرتے ہیں
کہ اس کو برقی گھڑیوں سے ناپتے ہیں
یہ زمین اِس کے حکم پہ ناچتی رہتی ہے
رات دن میں اور دن رات میں بدلتے رہتے ہیں
میں چلوں اب بہت دیر ہوئی جاتی ہے۔

○

رات

رات جب آتی ہے، ہزاروں رنگ روپ لے کے آتی ہے
امیر اپنے ایوانوں میں چراغاں کرتے ہیں، محفلیں گرم کرتے ہیں
غریب مکینوں اور مکانوں پر غم کی تاریکی چھا جاتی ہے
عابد اپنے خالق کے حضور سربسجود ہو جاتا ہے
بارہا وصل و ہجر کی کہانیاں دُہرائی جاتی ہیں
اِنسان نما حیوان نکل آتے ہیں دوسروں کی ملکیت غصب کرنے
انسانیت رات کی آغوش میں گہری نیند سو جاتی ہے
اور اُس کو اپنے خوابوں کا رازداں بنا لیتی ہے۔

○

میں اور میخانہ

شاعری پُر ہے شراب اور ساقی کے تذکروں سے
اور میخانہ مدتوں سے بنا ہوا ہے شاعر کا غریب خانہ
واعظ سے چھیڑ چھاڑ اُس کا مرغوب موضوع ہے
شاعر نے واعظ پر اتنے تیر چلائے ہیں
کہ اب اُس کے ترکش میں کوئی تیر باقی ہی نہیں
میں بھی شاعر ہوں لیکن وہ وضع مجھ میں نہیں
نہ تو میں پیتا ہوں، نہ پلاتا ہوں اور نہ ہی واعظ کو اپنا نشانہ بناتا ہوں
پچھلے دن ریستوراں میں ہجوم تھا تو مجھے میخانہ میں بٹھایا گیا
مجھے پریشان دیکھ کر ساقی بولیں: میں کھانا بھی پیش کرسکتی ہوں اور شراب بھی
پیٹ بھرنا، مدہوش کرنا یا ہوش میں رکھنا یہ سب میرے پیشے ہیں
کاش کہ واعظ دیکھ لیتا مجھے اِس صورت میں
کہ میں میخانہ میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہوں
اور مرے ایمان کی محافظت ساقی کر رہا ہے۔

○

ہم خیال

خیال ہے شرط ، ہم خیال بہتیرے
گر ڈھونڈ سکیں تو مل سکیں گے کہیں نہ کہیں
یہ خیال باطل ہے کہ حاملِ خیالِ دیگر دُشمن ہے
بحث و مباحثہ ہی وُسعت خیالی کا سرچشمہ ہے
نئی دنیا کی تخلیق کا نقشہ ہے
گر خیالات، خیالات کے عکاس ہی رہیں
ہماری تہذیب پھنس کے رہ جائے گی اِنحطاط کی دلدل میں
اور ہمارے مسائل پشتہا پشت رہیں گے وہیں کے وہیں۔

○

قوّت اِرادی اور مقدّر

قوتِ اِرادی اور مقدّر پر بحث چھڑ جاتی ہے
ہر دو کے حامی اپنے دلائل پیش کرتے ہیں
ایک کہتا ہے کہ انسان ذمہ دار ہے اپنے اعمال کا
دوسرا کہتا ہے کہ وہی ہوتا ہے جو مقدّر میں لکھا ہوتا ہے
تکرار پھر اور بھی آگے بڑھ جاتی ہے
گر انسان کے اعمال ازل سے ہی درج ہیں اُس کے مقدّر میں
تو اِس بے چارے کو کس شوق میں گُنہگار ٹھہرایا جاتا ہے
جب واعظ کے کان میں اس بحث کی بھنک پڑتی ہے
وہ قرآن شریف اُٹھا کر فوراً سامنے آجاتا ہے
کہتا ہے کوئی انسان جنبش بھی نہیں کرسکتا بغیر حکم خدا کے
شاعر اِس مباحثے اور دلائل سے سہم جاتا ہے
اِس محفل سے خاموشی سے کھسک جاتا ہے
اور عاشق اور معشوق، ساقی اور میخانے کے ذکر میں جا کر پناہ لے لیتا ہے۔

○

سنبھل کے چلو

سنبھل کر چلو اور قدم ناپو
چھپے ہیں ہزاروں راہ میں تضاد مشرب کے راہزن
دبوچ سکتے ہیں تمہیں کسی بھی بات کو لے کر
اُنہیں فکر نہیں تمہاری وُسعت خیالی کی
اُنہیں کچھ قدر نہیں تمہاری بے لوث زندگی کی
اُن کی نظر ہے حدِ نظر تک محدود
تمہارا ہر قول اور فعل مشتبہ ہے اُن کے لئے
اُنہوں نے راہ میں ہزارہا پھندے بچھا رکھے ہیں
تمہارا ہر نکتہ اور ہر پہلو اُن میں پھنس سکتا ہے۔

○

کارواں

کارواں کب کا جاچکا سوئے منزل
اور ہم ابھی تک نخلستان میں پڑے سوئے ہیں
کیا بانگِ درا سُنی نہیں ہم نے
کیا اپنے کارناموں کو بھلا دیا ہم نے
یونانی فیلسوف ہمارے مرہونِ منت ہیں
اُن کے کھوئے ہوئے اوراق کو پھر سے جان دی ہے ہم نے
اور انسان کی عظیم الشان خدمت کی ہے ہم نے
آؤ آنکھیں کھولیں اور دوڑ کے کارواں پکڑیں
ورنہ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خوابیدہ رِہ جائیں گے۔

○

لیڈر اور عوام

یہ لیڈر بھی
کیسے عجیب لوگ ہیں
چناؤ سے پہلے
اپنے چمچوں کے جھرمٹ میں
نعروں اور تالیوں کے بیچ
جگہ جگہ اپنا جھنڈا لہراتے ہوئے
بڑی بڑی تقریریں،
بڑے بڑے وعدے،
بڑے بڑے ارادے
سُنہرے خواب دکھاتے ہیں
جب یہ چُن جاتے ہیں
نہ خواب کا دَر کھلتا ہے
نہ خیال کا دَر کھلتا ہے
ملک میں کوئی تبدیلی آتی ہی نہیں

وہی بھوک وہی پانی اور بجلی کی کٹوتی
وہی ٹوٹی سڑکیں ، وہی ٹوٹے ڈیم
وہی بدحال ہسپتال
وہی کرپشن کا جال
وہی ٹیکس کی بھرمار، غریبوں کی جیبیں کاٹتی ہوئی
بس ایک بات میں ضرور اضافہ ہوتا ہے
اِن لیڈروں کے خزانے بھر جاتے ہیں
وہی وعدے وہی ارادے
ملک کو بہتر بنانے کے لیے
وہی منصوبے وہی ترقی کی راہیں
عوام اب اِن کو خوب سمجھ گئے ہیں
پھر بھی مجبور ہیں اِن ہی کو ووٹ دینے کے لیے
کوئی اچھا اور سچا قائد ہے ہی نہیں
کچھ بہتر ہے کچھ نہ ہونے سے
اس لئے عوام اپنا قیمتی ووٹ
ان کو سستے داموں میں بیچ دیتے ہیں۔

○

انسان اور میں

میں نے انسان کو سمجھنے کی بہت کوشش کی
لیکن مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا
جب بھی سمجھا کہ سمجھنے لگا ہوں اُس کو
اُس نے وہ رنگ دکھایا کہ میں حیران رہ گیا
میں نے سوچا
کیوں نہ اِس کوشش کو ہمیشہ کے لیے ترک کردوں
اور حتی المقدور خود ہی کو سمجھوں
شاید اِس کام سے انسان بھی سمجھ میں آجائے۔

○

کیا ہوا

وہ کُھلی کُھلی سی چلمن اور جھکی جھکی سی آنکھیں
تمہارا مسکرا کر سلام کرنا
نقش ہے دل پہ وہ لمحہ ہمارا تمہارا
پھر بارہا اُس طرف نظر کی
نہ تم ہی دِکھیں اور نہ ہی چلمن
ہر شخص تمہارے وجود سے منکر ہی رہا
اب میں اکثر سوچتا ہوں
یہ کیسے ہوا کیوں ہوا
شاید وہ میرے تعبیرِ خواب کا ایک لمحہ تھا۔

○

تو اور تیرا خیال

تیرا قرب روکے گا نہیں تیرے تخیل کو
میں تیرے خواب دیکھوں گا سحر ہونے تک
دن گزاروں گا کہانیاں لکھنے میں
اُن کا ہر کردار تیرا ہی عکاس ہوگا
میری زندگی بسر ہوگی حقیقت اور تصوّرات کی دوہری دُنیا میں
میں محبت کروں گا بیک وقت تجھ سے اور تیرے تصوّر سے
لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں تجھ میں اور تیرے تصوّر میں تضاد نہ پیدا ہوجائے
اور تجھے اپنے خیالات میں اتنا بدل دوں کہ پہچان نہ سکوں
اور پھر حقیقی تو اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوجائیں
اور صرف تیرا خیال، میرا ہمدم و رفیقِ زندگی بن کر رہ جائے۔

○

تم

کبھی تم جو میرے پاس تھیں
میرا حوصلہ میری آس تھیں
میری ہر خوشی میں شریک تھیں
میرے ہر غم میں تم مرے ساتھ تھیں
تم ملی تھیں مجھ کو ایک موڑ پر
ساری دُنیا کو پیچھے چھوڑ کر
میں خوش تھا بہت شاد تھا
ہر غم سے آزاد تھا
پھر اچانک یہ کیا ہوا
ایک قیامت ہوئی، ایک حادثہ ہوا
تم چلی گئیں مجھے چھوڑ کر
اُسی راہ پر اُسی موڑ پر
نہ مجھے تمہاری کچھ خبر ملی
نہ میں خود سے پیچھا چھڑا سکا

غمِ یار کی حدود سے نہ کہیں آ سکا، نہ کہیں جا سکا
بس رہ گئیں مرے پاس دل کی بے چینیاں
میرے حسین خوابوں کی کرچیاں
اُداسیاں، خموشیاں، ویرانیاں
دردو غم کی پرچھائیاں
اب دل کو نہ کوئی چاہ ہے
اب نہ ہی وہ موڑ ہے، نہ وہ راہ ہے۔

○

استاد اور شاگرد

شفقت اور احترام کے
تانے بانے سے بُنا ہوا
اُستاد اور شاگرد کا یہ رشتہ
کس قدر مقدس اور خوبصورت ہے
ایک اچھے اُستاد کی مثال
کمہار اور جوہری سے دی جاسکتی ہے
وہ کمہار جس کے ہونہار ہاتھوں میں آ کر
کچی مٹی حسین برتن کی شکل میں ڈھل جاتی ہے
وہ ماہر جوہری جس کی تراش خراش ہیرے کو چمکا کر
اُس کی قیمت اور حسن میں چار چاند لگا دیتی ہے
خوش نصیب ہیں وہ شاگرد جنہیں
اچھے اُستاد کی راہبری حاصل ہے
دورِ حاضر میں آ کر
اُستاد اور شاگرد کی محبت کا

اَٹوٹ رشتہ اَب ٹوٹ سا گیا ہے
اب نہ وہ قدریں ہیں اور نہ وہ جذبے ہیں
نہ وہ احترام ہے اور نہ وہ شفقت ہے
نہ اَب وہ اُستاد ہیں اور نہ وہ شاگرد ہیں
اب حصولِ علم کے لیے
توجہ کا مرکز انٹرنیٹ بن گیا ہے
اس میں شک نہیں کہ
انٹرنیٹ سے علم تو حاصل کیا جاسکتا ہے
مگر تربیت نہیں۔
آج وہ پارس جیسے اُستاد بھی کہاں
جو لوہے جیسے شاگرد کو سونا بنادیتے تھے۔

○

غمِ دوراں اور غمِ جاناں

غم دوراں اور غم جاناں میں
چولی دامن کا ساتھ ہے
یہ ندی کے دو کنارے ہیں
یہ زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں
آدمی جب عمرِ شعور کو پہنچتا ہے
اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے
یہ دونوں اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں
اُس کی زندگی میں خود بخود داخل ہو جاتے ہیں
غمِ دوراں حقیقت کی ٹھوس زمین پر چلتا ہے
غمِ جاناں تخیل کی حسین وادیوں میں بھٹکتا رہتا ہے
غمِ دوراں میں فکر معاش، ادائیگی فرض، کفالت کا بوجھ
روٹی کپڑا اور مکان اور ضروریات زندگی دامن گیر رہتے ہیں
اُداسیاں، ناکامیاں، مشقتیں، فکریں، ٹکّریں
تھکاوٹ، مفلسی، نصیب بن جاتے ہیں

غمِ جاناں میں حسن و عشق کی باتیں، بہاروں کے رنگ،
حسیں تخیل، ہجر و وِصال، وعدے وعید، جینے مرنے کی قسمیں
ذہن و دِل کو وادیٔ عشق میں بھٹکاتی رہتی ہیں
کوئی خوش نصیب ہی ہوگا
جو دونوں میدانوں میں جنگ جیت جاتا ہوگا
ورنہ عموماً غمِ دوراں کا اژدہا
غمِ جاناں کی مچھلی کو نگل لیتا ہے
اور پھر زندگی بس ایک سمجھوتہ بن جاتی ہے
آتشِ عشق ٹھنڈی راکھ میں تبدیل ہوجاتی ہے
غمِ جاناں، یادوں کا کھنڈر بن جاتا ہے
اور لیلیٰ و مجنوں کی روحیں ایک دوسرے کو پکارتی ہوئی
بھٹکتی رہتی ہیں دشت و صحرا کی تنہائیوں میں۔

○

جمہوریت

ایک وقت تھا کہ صرف ایک حکمراں ہوا کرتا تھا
جس کی زمین کو ہم چومتے تھے
جس پر ہم اپنا سب کچھ نچھاور کرتے تھے
لیکن اس کے نظام میں مساوات جیسی کوئی چیز تھی ہی نہیں
اتنے انسانی درجے بن گئے تھے
کہ عام اِنسان اُس کے بوجھ سے دبا جاتا تھا
اور احساسِ اخلاص کا فقدان ہی رہتا تھا
بالآخر اُٹھ کھڑے ہوئے لوگ
اور تخت شاہی پلٹ ڈالا
بادشاہت کو جمہوریت میں بدل ڈالا
بڑی توقعات وابستہ ہوئیں اِس انقلاب کے آنے سے
یکے بعد دیگرے لوگ کھڑے ہوگئے منتخب ہونے کو
بلند آواز میں وعدے کیے زندگیاں بدلنے کے
بولے کھیت لہرائیں گے سبز و شاداب فصلوں سے

صاف پانی ملے گا آبشاروں سے
گھر روشن ہو جائیں گے برق آسمانی سے
من و سلویٰ برسے گا آسمانوں سے
لوگ کام کریں گے بڑے بڑے ایوانوں میں
رہیں گے عالی شان مکانوں میں
لوگ جوق در جوق آگے بڑھے اور اُنہیں منتخب کیا
کرسی ملتے ہی ہر ایک حاکم وقت ہو گیا
لوگ حیرت میں تھے کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا
پہلے تو صرف ایک حاکم ہوا کرتا تھا
اِس جمہوریت نے تو سیکڑوں حاکم بنا ڈالے۔

○

عورت

جب بھی کرتا ہوں عورت کا تصوّر میں
اس کا حسن ، اُس کی ادا ، اس کی رعنائیاں
میرے ذہن و دل پہ چھا جاتی ہیں
دن گزرتا ہے اُس کے قصیدے لکھنے میں
رات گزرتی ہے اُس کے حسیں خواب تلے
ماں، بہن، بیٹی اور محبوبہ کتنے روپ ہیں اُس کے
اُس کے بطن سے سورما اور سالار جنم لیتے ہیں
ماں کی تڑپ اُولاد کے لئے یکتا ہوتی ہے
اُس کے پیروں کے نیچے اللہ نے جنت رکھی ہے
اُس کی گود ایک درسگاہ ہوتی ہے
اُس کی تربیت میں انسانیت
پلتی، بڑھتی اور سنورتی ہے
اُس کی حکمت عملی سے خاندان پروان چڑھتے ہیں
بحثییت بہن اُس کی محبت بے لوث اور لازوال ہوتی ہے

جب وہ بیٹی کے روپ میں آجاتی ہے
تو ہزار ہا محبتیں اُس پہ قربان کرنے کو جی چاہتا ہے
بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں حضور پاک ﷺ نے فرمایا ہے
جب عورت عشق کرتی ہے اپنا وجود بھول جاتی ہے
سمندر کی لہریں، پہاڑ کی چٹانیں اور آفتاب کی کرنیں
اُس کی محبت کے بالمقابل کمزور نظر آتی ہیں۔

○

نافرمانی

پچھلے دن میرے صاجزادے نے نافرمانی کی
میں نے غصہ میں کہا نکل جاؤ گھر سے یکدم
وہ بے ساختہ ہنس کر بولے
لگتا ہے اَب تاریخ پھر دُہراتی ہے
کیا مطلب؟
میں نے جھلاّ کر استفسار کیا
بولے کون بھول سکتا ہے حضرت آدم کا خلد سے نکالا جانا
میں نے کہا
نہ تو تم آدم ہو اور نہ ہی یہ جنت ہے، پھر یہ موازنہ کیسا
بولے اُنہوں نے اللہ کی نافرمانی کی تھی
اور اَب میں آپ کی نافرمانی کا مرتکب ہوں
لاجواب ہو کر اور سر پکڑ کے میں پلنگ پر بیٹھ گیا
بولے یہ ہماری بُنیاد ہے،
یہ جزوِ حیات ہے

اِسی کا سہارا لے کر ہم بڑے بڑے انقلاب لائے ہیں
ظالم شہنشاہوں کو پامال کیا ہے
ناانصاف حکومتوں کا تختہ پلٹا ہے
غلامی کی زنجیروں کو توڑا ہے
اختراعی قوتوں کو جنم دیا ہے
ہم عالم وجود میں ہیں
یہ دُنیا آباد ہے
حضرت آدمؑ اور بی بی حوا کی نافرمانی سے
میں نے کہا تم بات قرین قیاس تو کہتے ہو
لیکن ہر نافرمانی سے پہلے مجھ سے اجازت بھی ضرور لے لینا۔

○

پیار کا موسم

جانِ من!
کبھی کبھی میرا دل یہ چاہتا ہے
میں تم پر اتنا بگڑوں، اتنا برسوں
تمہاری چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر
میں تم کو اتنا سُناؤں
وہ سارے عیب گناؤں
جو تم میں بالکل نہیں ہیں
یہاں تک کہ تم چپ ہو جاؤ
تمہارا ضبط
تمہاری سرمگیں آنکھیں کے باندھ کو توڑ کر
تمہاری مسکراہٹوں کو بہالے جائے
اور تمہارے آنسو شبنم کی مانند
تمہارے پھول جیسے رُخساروں پر رُک جائیں
پھر میں لیٹے ہوئے ندامت سے چھت کو تکتا رہوں
تمہارے بارے میں پیار سے سوچتا رہوں
تمہارا دل کِھلانے کے جملے تراشتا رہوں

تمھیں منانے کے لیے الفاظ ڈھونڈتا رہوں
جب اس میں ناکام ہو جاؤں
تو سر دَرد کا جھوٹا بہانہ بنا کر
تم سے چائے کی ایک پیالی کی فرمائش کروں
میں جانتا ہوں کہ تم
میری ذرا سی تکلیف سے دہل سی جاتی ہو
پھر تم سے چائے کا کپ لے کر
تمھاری نازک کلائی کو پکڑ کر
تمھارے حسن کو اتنا سراہوں
تمھاری خوبیوں کو اِس قدر گناؤں
یہاں تک کہ تم
بہل جاؤ اور کھل کر مسکرانے لگو
جانتی ہو میری جان!
یہ فتور
میرے ذہن و دل میں کیوں آیا ہوا ہے
کہ ہمیشہ سے ہمارے گھر میں ایک ہی موسم چھایا ہوا ہے
پیار کا موسم، بہار کا موسم
میں ہر لمحہ تمھیں پیار کے نغمے سُناتا ہوں
تم میرے لئے ہمیشہ وفا کے گیت گاتی ہو۔

○

میں تم اور سمندر

میرے مضطرب دل میں
کتنا درد ہے، کتنی تڑپ ہے
کس قدر اُداسی ہے، کیسی تنہائی ہے
یہ تمہاری یاد ہے
جو ہر روز مجھے سمندر پہ لاتی ہے
تم چاند تھیں، مہہ جبیں تھیں
دل کی دُنیا تھیں، سب سے حسیں تھیں
میری اُلفت تھیں، میری رفاقت تھیں
یہ سمندر گواہ ہے ہم دونوں کی محبت کا
یہ سمندر راز داں ہے ہم دونوں کی چاہت کا
میں پہلی بار تم سے یہیں ملا تھا
اِسی جگہ ہم دونوں نے
ساتھ جینے اور مرنے کی قسم کھائی تھی
اِسی جگہ ہم نے اپنے دلوں کی دُنیا سجائی تھی

ہمارے خیالات میں ہم آہنگی تھی
گو کہ شوق ہم دونوں کے جداگانہ تھے
تمہیں بوٹنگ سے والہانہ عشق تھا
مجھے فشنگ سے بے حد لگاؤ
وہ ایک منحوس شام تھی
تم ناؤ لے کر سمندر پر
مجھے خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئیں
اور میں فشنگ کے لئے ساحل پر ٹھہر گیا

اب میں سوچتا ہوں
کاش اُس دن تم سمندر پر نہ جاتیں
کاش اُس دن میں ساحل پر نہ ٹھہرتا
کاش ہم دونوں ایک ہی تختے پر ہوتے
کاش یہ سمندر ہم دونوں کو
ایک ہی ساتھ نگل لیتا

تمہارے جاتے ہی میرے بلئے میں
ایک چمکیلی خوبصورت مچھلی آ گئی تھی

وہ کچھ دیر تڑپی اور پھر مرگئی
پہلی بار مجھے یہ لگا تھا
اپنی خوشی کی خاطر کسی کی جان لے لینا
کتنا بڑا ظلم ہوتا ہے

شام کا اندھیرا بڑھ رہا تھا
ایک بے نام خوف میرے دل میں گھر کر رہا تھا
تم نہیں لوٹیں تھیں
چند لمحے گزرے
مجھ پہ قیامت گزر گئی
کچھ لوگ پانی میں سے ایک لاش لا رہے تھے
وہ تم تھیں، میری زندگی تھیں
میرا پیار تھیں، میری ہر خوشی تھیں
ایک طرف مچھلی پڑی تھی
دوسری طرف تمہاری لاش رکھی تھی
میرے دل کی دھڑکنیں
مچھلی کی طرح تڑپ کر رُک سی گئی تھیں
مجھے ہوش نہیں مجھے کس نے سنبھالا

میں بُری طرح چیخیں مار رہا تھا
سمندر بھی میری طرح دھاڑیں مار رہا تھا
شاید مچھلی کی جدائی کا اُسے بھی غم تھا
ہم جس کے ساتھ رہتے ہیں
اُس سے کتنی محبت کرتے ہیں
سمندر تو ہماری محبت کا راز داں تھا
پھر وہ کیوں ہماری محبت کا راہزن بن گیا
کیا یہ اُس کا جذبۂ انتقام تھا؟
یا مچھلی کے دل کی بد دعا تھی؟
یا پھر میرے ظلم کا نتیجہ تھا؟

میں ہر روز یہاں آتا ہوں
ایک بھٹکتی ہوئی روح کی طرح
اپنے دل میں احساسِ جرم لے کر
سمندر خاموش ہو گیا ہے
لگتا ہے وہ بھی اپنے انتقام پر شرمسار ہے

آج چودھویں کی رات ہے

آسمان پر چاند تمہاری صورت میں چمک رہا ہے
میں لہروں میں دیکھ رہا ہوں
تمہارا عکس پانی میں جھلملا رہا ہے
مسکرا رہا ہے
تم مجھ سے باتیں کرنے لگیں
میں تم سے باتیں کرنے لگا
غمِ دل بہلنے لگا
دردِ دِل سنبھلنے لگا
اچانک کالے دیو جیسے بادل نے
تمہارے چاند چہرے کو زبردستی سے ڈھانک دیا
تیز برسات ہونے لگی
مجھے لگا اَبر کے پردے میں تم
زار زار رو رہی ہو
بجلیوں کی شکل میں تم تڑپ رہی ہو
بادلوں کی گرج میں تم چیخ رہی ہو

لاچاری اور بے بسی کے عالم میں
بھاری دل لیے بوجھل قدموں سے

میں گھر لوٹ آیا
سوچ رہا تھا ہر رات کی طرح آج بھی
میرے دل کا بوجھ
مجھے سونے نہیں دے گا
شاید خدا کو مجھ پر رحم آ گیا تھا
تمہارا چاند سا چہرا
میرے دل کے سمندر میں
پھر جِھلملانے لگا
اور شبِ فرقت میں مجھ کو
شب وصل کا لطف آنے لگا۔

○

محبت کے رنگ

گہرے سُرمئی بادلوں کی اُوٹ سے
قوس قزح نے مسکرا کر
جیسے ہی جھانکا
ہر طرف شادمانی چھانے لگی
ہر سمت نکھار آ گیا
بھیگی پتیوں کی آنکھوں کے آنسو تھمنے لگے
پھولوں کے دل کا بوجھ ہلکا ہونے لگا
اُن کے چہروں پر بحالی آ گئی
ایک حسین لطیف خوشگوار ماحول پیدا ہو گیا
اُس نے مجھ سے کہا:
آؤ
ہم اور تم
قوس قزح کے ان حسین رنگوں کو
اپنے دامن میں اس طرح بھر لیں
کہ زندگی کا ہر لمحہ محبت کے رنگ میں رنگ جائے۔

○

چیونٹیاں

دیکھ کر چیونٹیوں کی لمبی قطار
میں نے سوچا یہ ننھی سی جانیں
کس قدر منظم ہیں
چلی جا رہی ہیں اپنا توشہ لیے، اپنی دُھن میں
نہ آپس میں کوئی جھگڑا ہے نہ کوئی بیر
نہ نوچ کھسوٹ، نہ لوٹ مار
نہ جلن، نہ حسد، نہ بغض، نہ کینہ
آپس میں کتنی محبت کتنا رکھ رکھاؤ ہے
راستے میں گر کوئی چیونٹا یا چیونٹی مر جاتی ہے
تو اُٹھا کر سب لے جاتی ہیں اُسے
تکفین اور تدفین کے لیے
کتنی جاں فشاں ہیں یہ
کرتی ہیں بہت پہلے سے انتظام اپنی ضرورتوں کا
گامزن رہتی ہیں اپنے مقصد کی طرف

یکجہتی کی ہیں یہ عجیب مثال
کاش کوئی دُنیا کے لوگوں سے یہ کہہ دے،
''چیونٹیوں ہی سے سیکھ لیں جینے کا ہنر
اور طے کریں اپنی زندگی کا سفر''

○

میری توبہ

مجھے یاد ہے میرے بچپن میں
دادی جان قرآن شریف پڑھا کرتی تھیں
اور مجھے بلا کر دَم کرتی تھیں
اُن کی زبان سے بارہا میں نے
سورۂ رحمٰن کی آیت سُنی تھی
''تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''
اُس وقت میرے بچپن میں
میرے لئے رب کی نعمتیں تھیں
میرے کھلونے، جو چچا جان مجھے دِلاتے تھے
وہ چاکلیٹ کے پیکٹس جو ابّا جان میرے لئے لاتے تھے
وہ مٹھائیاں جو ماموں جان مجھے کھلاتے تھے
مجھے جلیبی سے عشق تھا
دھیرے دھیرے میرا بچپن پیچھے جانے لگا
اور میں اسکول جانے لگا

کتابیں میری دوست بن گئیں

میں اپنے ساتھیوں میں قابلِ رشک تھا

اور اپنے اساتذہ کی نظروں میں قابلِ فخر تھا

مجھے ایک ہی دُھن تھی علم کی بلندیوں پر پرواز کرنے کی

اس لیے برائیاں مجھے منہ چڑا کر مجھ سے کترانے لگیں

اپنے رب کے بارے میں سوچنا کم ہوتا گیا

میں اپنے بارے میں زیادہ سوچنے لگا

اپنا راستہ ، اپنی رہ گزر

اپنی ترقی ، اپنا کیریئر

اپنا مقصد، اپنی خواہشیں، اپنی منزل،

اپنی چاہت، اپنی محبت

میرے رب ! تیرے کرم سے سب کچھ پا گیا

میں تجھے ہر لمحہ بھولتا رہا

اور تو عطاؤں پر عطائیں کرتا رہا

آج مصلّے پر بیٹھا ہوا میں

اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں

کیا کھویا، کیا پایا

اپنی کوتاہیوں کو تولتا ہوں

تیری عنایتوں کے پلڑے میں
تو شرمسار ہو جاتا ہوں
پلٹ کے دیکھتا ہوں اپنی زندگی کی لمبی رہ گزر
ٹٹولتا ہوں جب اپنے اثاثے کو
خالی پاتا ہوں اپنے عمل کا خزانہ
نہ بندگی ہے نہ حسنِ طاعت
نہ کثرتِ توبہ ہے نہ شکرِ نعمت
اپنی کوتاہیوں کا احساس مجھے پانی پانی کر دیتا ہے
''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''
ندامت سے میری جبیں کے ساتھ میرا دل بھی سجدۂ شکر بجا لاتا ہے
میرے رَب! میری توبہ قبول کر
میری آنکھیں برسنے لگتی ہیں
مجھے یاد آتا ہے کہ میری امّی مجھ سے کہا کرتی تھیں
''پانی برستے میں جو دعا کی جاتی ہے
وہ دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔''

○

شہزاد رضوی کے کلام میں مشرقی سادگی، سچائی، حق گوئی، معصومیت، دلکشی گہرائی اور سنجیدگی ہے تو دوسری طرف مغرب کے فن کی روانی اور تیز رفتاری ہے۔ ان نظموں میں زندگی کی تلخی، ماضی کی یادیں، حسن و عشق کی باتیں، نفسیات، عقائد، فلسفے اور غور و فکر ہے۔ ان نظموں کا لہجہ نیا ہے، زبان اور بیان میں شیرینی، دلکشی اور نغمگی ہے۔

سید ضیاء خیر آبادی

☆☆

شہزاد رضوی کی نظموں میں عصر جدید کے مسائل اور ان کا حل ہے، اس کے ساتھ خواب غفلت سے بیداری، صحت مند رجحانات، وسعت قلب و نظر، زندگی کی خوش حالی اور بہبودی، بلند ترین اخلاقی نکات ذہنوں کے بند دریچے کھولتے ہیں اور فکر و نظر کی روشنی میں تاریکی سے نکاس کا راستہ دکھاتے ہیں۔

رخسانہ وسیم
اٹلانٹا (امریکہ)

☆☆

ڈاکٹر شہزاد رضوی کی یہ نظمیں زندگی کے ہر رنگ سے مانوس ہیں۔ ان میں ہماری تہذیب و تمدن کی بھرپور عکاسی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ضرورتوں کی اہمیت ہے، آج کے تعلیمی دور کی روشن خیالی ہے، حسن و عشق کی پاکیزگی اور اس کا تقدس ہے۔ غم کی وسعت و گہرائی و گیرائی ہے، درد کی تڑپ ہے، پیار کے نغمے ہیں، خیالات و تخیلات کا حسن ہے، جذبات کی شدت ہے، احساسات کی نزاکتیں ہیں، دل مضطرب کی کیفیتیں اور ان کی سچی اور صحیح عکاسی ہے۔

سیدہ ناہید نشتر خیر آبادی
اٹلانٹا (امریکہ)

"CHALTE CHALTE"

By

Shazad Rizvi

ڈاکٹر شہزاد رضوی کا تعلق یو.پی. کے ایک مردم خیز قصبے خیرآباد سے ہے۔ خیر آباد جہاں ہر دور میں حریت پسندوں، عالموں، دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کی ایک ایسی کہکشاں بجی رہی کہ اِسے مدینۃ العلوم کے نیک نام سے بھی موسوم کیا گیا۔ شہزاد رضوی بھی خیرآباد کے ہی ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں ہر ہستی آفتاب و مہتاب تھی۔ چوتھی نسل میں اُن کا براہِ راست رشتہ اپنے زمانے کے حریت پسند انقلابی فضل حق خیرآبادی اور غالبؔ کے عزیز دوست میر تفضل حسین خاں سے ملتا ہے۔ مضطرؔ خیرآبادی کے پوتے شہزاد رضوی نے اپنی خاندانی وراثت کو قائم رکھا۔ وہ بیک وقت انگریزی کے ممتاز فکشن نگار اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ، اس کے باوصف کہ اُنہوں نے دیارِ غیر کو اپنا وطن ثانی بنالیا ہے، اپنی مادری زبان اُردو کی محبت سے سرشار ہیں اور اُس میں بھی فکرِ سخن کے چراغ روشن کرتے رہے ہیں۔ دراصل ڈاکٹر شہزاد رضوی کی شخصیت مشرق اور مغرب کا سنگم ہے۔ اُن کی شاعری میں مشرقیت اور مغربیت کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے نثری نظم کو اپنا اسلوبِ سخن قرار دیا ہے اور روایتی موضوعات سے ہٹ کر اُن موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جو آج کی عصری حسیت سے عبارت ہیں۔ ''چلتے چلتے'' اُنہی شہزاد رضوی کا مجموعۂ سخن ہے جن کی شاعرانہ وراثت کا ایک زمانہ معترف ہے۔